کرن داؤد بٹ

بلوچستان میں اردو کی ادبی تحقیق کے مسائل

بلوچستان میں اس وقت سات جامعات سرکاری اور چار نجی شعبوں میں کام کر رہی ہیں جن میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو قائم ہونے والی بلوچستان یونیورسٹی یہاں کی سب سے پرانی جامعہ ہے۔اس کے علاوہ انجینئرنگ یونیورسٹی خضدار، بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کوئٹہ، سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی بلوچستان کوئٹہ، یونیورسٹی آف کیچ تربت، یونیورسٹی آف لورالائی اور یونیورسٹی آف میرین سائنسز لسبیلہ شامل ہیں۔جب کہ غیر سرکاری یونیورسٹیوں میں الحمد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کوئٹہ ایک نئی یونیورسٹی ہے ۱۔ اس وقت کوئٹہ میں اقراء یونیورسٹی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اور ورچوئل یونیورسٹی کے کیمپس بھی قائم ہیں جو مختلف شعبوں میں تحقیقی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ان گیارہ جامعات میں سے صرف دو میں شعبہ اردو قائم ہے۔جن میں سے ایک یونیورسٹی آف بلوچستان اور دوسری سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی بلوچستان ہے۔جب کہ باقی سات یونیورسٹیوں میں یہ شعبہ مفقود ہونے کی وجہ سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ۷۸ فیصد جامعات میں اردو کی بحیثیت مضمون کوئی جگہ اس لیے نہیں بنتی کہ اب اردو زبان وادب کے ماہرین کی مارکیٹ میں کوئی گنجائش نہیں رہی ہے؟

اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے اعلیٰ درجہ کی سندی تحقیق کو مارکیٹ سے وابستہ کرنے پر بہت زور دیا جانے لگا تھا۔جس کی وجہ سے بنیادی سائنسز، نیچرل سائنسز، لائیو سائنسز، مینجمنٹ سائنسز اور سوشل سائنسز کے بعض شعبوں میں اس جانب علمی تحقیق کے رخ موڑ دیئے گئے۔مگر ادبیات، فلسفہ اور تاریخ جیسے مضامین میں عمل تحقیق کو مارکیٹ سے جوڑنے کا فلسفہ قابل عمل نہیں تھا۔اس لیے اردو پر اس کے اثرات یوں مرتب ہوئے کہ نئی جامعات نے اردو کے شعبے قائم کرنے پر توجہ نہ دی ۲۔ یوں اردو میں سندی تحقیق کی وہ رفتار سست تر ہوگئی جو پہلے ہی سست روی کا شکار تھی۔اکیسویں صدی میں سندی تحقیق کو اس وقت ایک اور بھاری پتھر کا سامنا کرنا پڑا جب ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان اسلام آباد نے ایم فل اور پی ایچ ڈی اردو میں داخلے کے امتحان جی آر ای (GRE) ٹیسٹ میں کام یابی کو لازمی قرار دے کر سختی سے عمل درآمد بھی شروع کروادیا۔ان

وجوہات کی بنا پر درج ذیل اندوہ ناک نتائج سامنے آئے۔

الف: جامعات کے شعبہ اردو میں داخلوں کا تناسب ہمیشہ ہی سے کم چلا آرہا ہے۔اس شعبہ میں دو ہی قسم کے طلبا اور طالبات داخلہ لیتے ہیں اول وہ جنھیں اور کہیں داخلہ نہیں ملتا۔مگر ایم اے کرنا ضروری سمجھتے ہیں یا وہ جو اردو میڈیم میں پڑھتے چلے آنے کی وجہ سے ان مضامین سے بھاگتے ہیں جو انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔

ب: شعبہ اردو میں مجموعی طور پر جو طلبا و طالبات داخلہ لیتے ہیں ان کی علمی سطح بہت کم ہوتی ہے۔اور اردو سے عمومی واقفیت کا معیار بھی نچلے درجے پر ہوتا ہے۔مگر ایف اے اور بی اے میں پڑھے جانے والے دوسرے مضامین کے مقابلے میں اردو کا معیار قدرے بہتر ہوتا ہے۔زبان میں قواعد کی غلطیوں کا کوئی حساب ہی نہیں ہے[۳]۔لہذا پہلے ایم اے اور بعد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر بالعموم یہ خلا پر نہیں ہوتے۔ایسے طالب علم اگرچہ بی اے میں انگریزی پڑھتے ہیں لیکن ان میں بھی کم زوریوں کے بہت سے پہلو تسلسل سے جاری رہتے ہیں۔

ج: عموماً کسی بھی علم کے حصول کا جو معیار اور سطح مقرر کی جاتی ہے وہ کسی خاص درجے اور مخصوص عمر کے لیے ہی ہوتا ہے۔سابقہ درجات سے گزر جانے کے بعد نسبتاً نچلی سطح کے درجات کے مضامین پر گرفت حاصل کرنا اس لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ احساس برتری کی وجہ سے اس میں دل ہی نہیں لگتا ہے۔بسا اوقات یہ ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔کیوں کہ توجہ اور دل چسپی کا معیار وہ نہیں رہتا جو اصل وقت پر موجود ہوتا ہے۔نتیجتاً وہ خلا جو ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے۔وہ نت نئی کوششوں کے باوجود پر نہیں ہوتا۔

د: اردو میں ایم اے اور پھر ایم فل میں داخلہ لینے والے طلبا کی انگریزی، ریاضی اور معلومات عامہ کی شد بد بھی کمزور ہوتی ہے۔اردو پر تو ایک مرتبہ لگ کر کام کرنے سے گرفت پیدا ہونے لگتی ہے لیکن مذکورہ مضامین مجبوراً پڑھنے کی وجہ سے کبھی بھی ان میں بہتری کی صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔

ہ: جی آر ای میں انگریزی، معلومات عامہ، ریاضیاتی اور شماریاتی بجھوتیاں ہوتی ہیں، اس لیے اردو کے طالب علموں کا ان امتحانات میں کام یابی حاصل کرنا ایک خواب ہی بنا رہتا ہے۔یہ طالب علم فیل ہو کر پھر امتحان دیتے ہیں اور پھر فیل ہو جاتے ہیں۔سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی کے ایم فل سیشن ۱۱۔۲۰۰۹ء کی آٹھ طالبات میں سے صرف ایک نے جی آر ای میں کام یابی حاصل کی جب کہ سیشن ۱۲۔۲۰۱۰ء کی تین طالبات میں سے کسی ایک کو بھی کوئی کام یابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

ان دونوں سیشن کی طالبات میں سے بعض نے تو کئی کئی مرتبہ امتحان دیے مگر ناکام رہیں۔

سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی میں ایم فل سیشن ۱۲۔۲۰۱۳ء کے داخلوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ جن کی بنیادی شرائط میں جی آر ای پاس کرنا ضروری تھا۔ سائنسز اور سوشل سائنسز کے ۱۲ شعبوں میں داخلے مطلوب تھے۔ گیارہ شعبوں میں درخواست گزاروں کی اکثریت جی آر ای پاس شدہ تھی۔ جب کہ شعبہ اردو کی گیارہ امیدواروں میں سے کسی ایک نے بھی جی آر ای نہیں کیا تھا۔ مجبوراً یونیورسٹی انتظامیہ نے شرائط میں نرمی کرتے ہوئے امیدواروں کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ دو سالہ کورس کے دوران میں مذکورہ امتحان پاس کر لیں ورنہ انہیں ایم فل کا حتمی امتحان دینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بلوچستان یونیورسٹی میں تین (مرد) طالب علموں نے جی آر ای کے بعد ایم فل میں داخلہ حاصل کیا۔ ان میں بھی دو کے کوائف ظاہر کرتے ہیں کہ انھوں نے بی ایس سی کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں جی آر ای کرنے میں آسانی رہی۔

آرٹس کے مضامین کا انتخاب کرنے والے میٹرک (ثانوی درجہ) تک جنرل ریاضی پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا ریاضی پڑھنا موقوف ہو جاتا ہے۔ اس کے متبادل کے طور پر وہ دیگر مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ جب کہ انگریزی لازمی صرف بی اے تک پڑھنا ہوتی ہے۔ ایم اے میں نہیں پڑھائی جاتی۔ لہٰذا جی آر ای میں ریاضی اور انگریزی کی صلاحیت کے تقاضے ان سے کوشش کے باوجود پورے نہیں ہو پاتے۔ دوسری طرف انگریزی کی واقفیت اور اس میں لکھنے پڑھنے کی استعداد اس قدر کم زور رہتی ہے کہ اب جامعات میں ایم اے/ایم ایس سی کی سطح پر ایک سو نمبر کا ایک مضمون ''فنکشنل انگلش'' جبراً پڑھایا جاتا ہے تاکہ انگریزی کی عمومی واقفیت کی سطح بلند ہو سکے۔ فی الوقت اس کے نتائج بھی خاطر خواہ نظر نہیں آتے۔ کیوں کہ ۳۰ فی صد کے لگ بھگ طلبا اس میں بھی فیل ہو جاتے ہیں۔

اس صورت حال نے بلوچستان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی اردو کے داخلوں پر ایسی روک لگا رکھی ہے کہ اصل مضمون کے انتہائی باصلاحیت طالب علم جن میں سے بعض انھیں جامعات میں مسلمہ ماہر استاد بھی ہیں۔ ایم اے اردو کے بیسیوں طالب علموں کی تدریسی ضروریات کو احسن طریقے سے پورا کرتے ہیں۔ وہ بھی مذکورہ ننگی تلوار سے زخمی ہیں۔ بلوچستان کی ان دو جامعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کر کے نکلنے والوں کی تعداد تشویش ناک حد تک کم ہوگئی ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بلوچستان یونیورسٹی سے ایم فل کے صرف دو طالب علم کام یاب ہو سکے ہیں۔ یہ بھی وہ امیدوار ہیں جن کی رجسٹریشن جی آر ای لازمی ہونے سے

پہلے کی تھی۔ اسی جامعہ میں جی آر ای لازمی ہونے کے بعد پوری دہائی میں صرف تین داخلے ایم فل میں ہوئے ہیں۔ اسی طرح اسی عرصے میں پی ایچ ڈی کا صرف ایک امیدوار کام یاب ہوا ہے۔ سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی میں اب تک کسی نے ایم فل میں کام یابی حاصل نہیں کی ہے۔ جب کہ یہاں پی ایچ ڈی ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔

۲۰۱۱ء میں سردار بہادر خان وومنز یونیورسٹی کی صدر شعبہ اردو نے اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین ڈاکٹر انوار احمد سے اس سلسلے میں رابطہ کیا۔ اور ان کی مشاورت سے صدر شعبہ اردو اور ڈین سوشل سائنسز نے بھی ہائر ایجوکیشن کمیشن کے متعلقہ شعبوں کو اس بارے میں خصوصی معروضات پیش کیں۔ مقتدرہ قومی زبان سے درخواست کی گئی کہ اگر داخلوں کے لیے کسی امتحان کی شرط ضروری بھی ہے تو صرف مضمون (اردو) کا امتحان دے کر استعداد کار کو ناپا جائے۔ ورنہ بلوچستان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی اردو کرنا محض خواب بن کر رہ جائے گا۔ جس کے منفی نتائج یہ ہوں گے کہ نہ صرف ایک اہم مضمون میں بلکہ پاکستان کی قومی زبان اردو میں تحقیق کا عمل اس خطے میں مفقود ہو کر رہ جائے گا۔ جس کے ہمہ گیر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ مگر اس مراسلت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ حد تو یہ ہے کہ کسی نے انکار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کو چلانے والے ماہرین کی خدمات سے انکار نہیں ہے۔ مگر ضروری ہے کہ پالیسی سازی میں اردو کے اساتذہ کو بھی شامل کیا جائے۔ بالخصوص بلوچستان کی جامعات کے ان اساتذہ کو ضرور مشاورت کا حصہ بنایا جائے جو اردو میں تحقیق کر رہے، اور کروا رہے ہیں۔ جی آر ای کے بارے میں مختلف جامعات کی حکمت عملی بھی مختلف ہے۔ کہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس سلسلے میں سندھ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کی مثالیں اہم ہیں۔ سندھ یونیورسٹی کے مطبوعہ پراسپیکٹس ۱۲؎ سے واضح ہے کہ یہ جامعہ اسے خاطر میں نہیں لاتی۔ بلکہ تحقیق کے طلبا کے داخلوں کے لیے انھوں نے خود اپنا نظام وضع کر رکھا ہے۔ جو ان کے بااختیار ہونے کا اظہار ہے اور ایچ ای سی کے اس دعوے کی تصدیق ہے کہ وہ جامعات کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی، صرف معیار پر نظر رکھتی ہے۔ بلوچستان میں بھی سندھ یونیورسٹی کی طرز پر داخلوں کے معاملات استوار کر لیے جائیں تو توقع ہے کہ مستقبل میں یہاں سے بھی ماہر محققین کی کھیپ پیدا ہو سکے گی جن کی اردو کے لیے خدمات بہت بار آور ثابت ہوں گی۔ بلوچستان کے اس خصوصی منظر نامے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہاں سندی تحقیق کے سفر کی پیمائش کی جائے تو مجموعی صورت حال یوں ابھرتی ہے:

سندی تحقیق کے ابتدائی مراحل میں تو طالب علم اپنے اس ذوق کو دریافت ہی نہیں کر پاتا ہے۔ وہ سند کے حصول کی درسی مجبوری کے تحت تحقیق کرتا ہے۔ جیسے ایم اے کے طلبا اور طالبات کی یہ مجبوری ہے کہ

دوران تعلیم ایک مخصوص مرحلے پر تحقیق کریں۔ دراصل اس درجے پر زیادہ تر تحقیق کی نہیں جاتی بلکہ کروائی جاتی ہے۔ تحقیق سے کان آشنا ہونے کے باوجود ذہن اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ ذہن کو بنانے کے لیے بھی شعبہ اردو کے سربراہ اور اساتذہ کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ یہاں نگرانی، رہنمائی سے بڑھ کر استاد کی دل چسپی اور قدم قدم پر انگلی تھام کے آگے بڑھانے کی کوششیں بن جاتی ہیں۔ امیدواروں کا مزاج بنانے کے لیے استادانہ شفقتوں کے تمام دروازے کھولنا پڑتے ہیں۔ ایک طرح سے طالب علم ہی کو سب کچھ کرنا چاہیے اور نگراں کو اہم نکات بتا کر اس کی تحریر کو سرسری دیکھ کر گزر جانا چاہیے۔ بطور اصول تو درست بات ہے۔ مگر یہاں نگراں کا کام اس سے بہت زیادہ ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر ایم اے کی سطح کا مقالہ تیار ہو کر امتحان کے عمل سے گزرتا ہے۔ ایم اے کے بعد کا اگلہ مرحلہ ایم فل کا ہے۔ یہاں صورت حال صرف اس قدر تبدیل ہوتی ہے کہ طالب علم جن کی غالب اکثریت شعبہ تدریس سے وابستہ ہوتی ہے، ترقی اور مالی منفعت کے لیے یہ بیڑا اٹھانے آتے ہیں۔ ان میں سے بھی بیش تر ایسے امیدوار ہوتے ہیں جنھوں نے ایم اے کا مقالہ نہیں لکھا ہوتا۔ لہٰذا عملاً یہ طبقہ بھی اسی طرح تحقیق سے نابلد ہوتا ہے جس طرح ایم اے کے طالب علم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی کم و بیش وہی رویہ رکھنا پڑتا ہے جو ایم اے کے محققین کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ان میں ایسے امیدوار جو پہلے سے مرتب تحقیقی مشق اور ذوق کے ساتھ آتے ہیں نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی پس منظر میں کسی نہ کسی طور جبر کے عوامل محرک کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں ایم اے کے بعد ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی کرنے کی روایت بڑی کم زور ہے۔ پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرانے والے بیش تر طالب علم ایسے ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کسی بھی درجہ کی سندی تحقیق نہیں کی تھی۔ انھوں نے براہ راست پی ایچ ڈی یا ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ ڈی میں داخلہ لے کر اپنی تحقیق مکمل کی تھی۔ بیسویں صدی میں ایسی بہت کم مثالیں ملتی ہیں جو اس بات کی شہادت پیش کریں کہ امیدوار نے پہلے ایم فل کی ڈگری لی ہو اس کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ حاصل کیا ہو۔ حالانکہ محقق کا ذہنی اعتبار سے بھی محقق ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں محقق کی اولین اپچ کا تعین ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ایک محقق کے لیے جو بنیادی طور پر محقق ہے، اول و آخر محقق ہے، یہ محقق کی ایک اضافی خوبی نہیں بلکہ یہ ایک طرز زندگی، ایک لائف اسٹائل ہے۔ ہمارے اعلیٰ پائے کے محققوں نے ہمارے اپنے زمانے میں اور محقق محدثین نے گذشتہ سالوں میں زندگیاں اسی طرز پر گزاری ہیں۔ وہ تلاش حقیقت یا تلاش حقائق کے بڑے جویا تھے اس کے لیے بڑی کھکھیڑ اٹھانے والے، سفر کرنے والے اور آرام کو تجنے والے تھے۔۔۔ انھوں نے تحقیق کو چند روزہ شغل یا تمیض یا فیشن نہیں بنایا، جس کے لیے ظاہر ہے کہ بڑی سچی لگن چاہیے۔''[۵]

اکیسویں صدی میں ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد کی طرف سے نافذ العمل پابندیوں کی وجہ سے ایم۔فل اور اس کے بعد پی ایچ ڈی کی روایت کو مجبوراً فروغ حاصل ہوا ہے۔لہٰذا یہ کہنا کہ طالب علم کا اپنا ذوق تحقیق ہی اسے اعلیٰ ترین تحقیق کی طرف گامزن کرتا ہے، بہت کم کم رہا ہے۔بلوچستان کے ایک اہم محقق کے ابتدائی سندی تحقیق کے مراحل کے بارے میں لکھا جانے والا یہ نتیجہ یہاں ایسی صورت حال کی تصویر کشی کی مثال ہے: ''فاروق احمد صاحب کا رجسٹریشن عدم دلچسپی کے باعث منسوخ کر دیا گیا۔''[۶]

ڈاکٹر فاروق احمد جیسے اہم محقق کی ابتدائے تحقیق میں جب یہ صورت حال تھی تو باقیوں کی کیا رہی ہوگی؟ یہ جاننا مشکل کام نہیں ہے۔دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے، بہت سے محقق یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ پی ایچ ڈی کے آگے بھی سندی تحقیق ممکن ہے۔نہ ہی اس کی مادی اور علمی افادیت سے آگاہی ہے۔لہٰذا اس تحقیق کے دوران ایک آدھ محقق کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ملا جو اس کا ذوق رکھتا ہو۔اور جسے یہ معلوم ہو کہ ان بلند درجہ سندی تحقیق میں داخلے کے مراحل کیا کیا ہیں۔اور ان درجات میں کس نوعیت کی تحقیق سے گزرنا پڑتا ہے۔سوم یہ کہ جامعات میں بھی ان درجات کی تحقیق کے لیے آگاہی موجود نہیں ہے۔مختلف درجات کی سندی تحقیق کے معاملات کو چلانے والے جامعات کے متعلقہ حکام کی بھی اس بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔نہ ہی جامعات کی طرف سے مختلف تعلیمی درجات میں داخلے کے لیے جو اشتہار دیے جاتے ہیں ان میں ان اعلیٰ درجات کی تحقیق کا اب تک کوئی ذکر ہوتا ہے۔آئندہ کبھی کسی کو اس کا خیال آ جائے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔لیکن جب کبھی ایسا ہو جائے گا تو اسے بلوچستان میں اردو سندی تحقیق کی بڑی کامیابی ضرور کہا جائے گا۔فی الوقت اس کے دور دور تک آثار موجود نہیں ہیں نہ کسی محقق یا محققین کی طرف سے ایسا کوئی دباؤ موجود ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں اس کے امکانات موجود ہیں۔

سندی مقالات کے معیار کی جانچ کے بہت سے پہلو تراشے جا سکتے ہیں لیکن سہولت کے لیے انھیں دو موٹے موٹے حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے۔یہ تقسیم صورت حال کو سمجھنے میں آسان اور مفید ہے۔اس سے تہ میں چھپے ہوئے مسائل کا ادرک بھی ہو سکتا ہے۔ان میں سے ایک حصہ مقالات کی صوری کیفیت ہے اور دوسرا حصہ اہل تحقیق کے تراشے گئے وہ تحقیقی معیارات ہیں جو تحقیق کو منظّم صورت میں لا کر استخراج نتائج کا باعث بنتے ہیں۔پہلی صورت حال کو ایک منظّم اور یکساں ڈھانچے میں رکھنے کے لیے جامعات نے اپنے اپنے اصول اور قانون مرتب کیے ہیں۔اس سلسلے میں بھی دل چسپ بات یہ ہے کہ مقالہ نگار کی آگہی کے لیے قوانین عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔اسے صرف ان چیدہ چیدہ امور سے آگہی حاصل ہوتی ہے جو نگراں وقتاً فوقتاً زبانی طور پر فراہم کر دیتا ہے۔یا متعلقہ جامعہ کے شعبہ اردو سے چند بنیادی باتیں اس کے اصرار پر اسے ٹالنے

کے لیے بتادی جاتی ہیں۔ یہ صورت حال اس وقت اور بھی گھمبیر ہو جاتی ہے جب نگراں ایک جامعہ کے طلبا کی نگرانی کرتے کرتے اچانک کسی دوسری جامعہ کی سندی تحقیق کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دینے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے ذہن میں پہلی جامعہ کے بھی اہم امور ہوتے ہیں۔ وہ بلاتحقیق انھیں اصولوں کا اطلاق دوسری جامعہ کے مقالات پر بھی کروا دیتا ہے۔ یوں مقالات کی صوری کیفیت کی وہ یکسانیت جسے حاصل کرنے کے لیے اصول وضع کیے جاتے ہیں انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تمام جامعات کا طے شدہ اصول یہ چلا آتا ہے کہ مقالات A.4 سائز کے سفید ۷۰ گرام کاغذ پر ٹائپ یا کمپوز کروا کر پیش کیے جائیں۔ بلوچستان میں کاغذ کی کوئی الگ مارکیٹ نہیں ہے۔ یہاں کا واحد تجارتی شہر کوئٹہ ہے اور یہاں بھی اسٹیشنری کی چند دکانوں میں مطلوبہ کاغذ دستیاب ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے A.4 سائز کی اصل پیائش کا کاغذ قسمت والوں کو بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ لمبائی چوڑائی کی یکسانیت تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے بھی بڑھ کر ہے۔ ایک امیدوار نے اپنا مقالہ A.4 کاغذ پر کمپوز کروا کے پیش کیا تو جامعہ کے متعلقہ دفتر نے اس کی پیمائش شروع کر دی اور لمبائی چوڑائی میں چند سوت کی کمی بیشی کی وجہ سے مقالہ جمع کرنے سے انکار کرتے ہوئے مطلوبہ پیائش بتائی کہ صرف ایسے ہی کاغذ پر پیش کیے جانے والا مقالہ امتحان کے لئے قبول کیا جائے گا۔ امیدوار اور ان کے اہل خانہ نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایک ایک دکان چھان ماری مگر مقررہ پیائش کا کاغذ دستیاب نہیں ہوا۔ ایک اسٹیشنری والے نے اس کا حل یہ نکالا کہ کچھ اضافی رقم میں وہ مطلوبہ پیائش کا کاغذ کٹوا کر فراہم کر دے گا۔ جب اس کاغذ کو خرید کر پیائش کی گئی تو وہ بھی طول وعرض میں مقررہ معیار کے مساوی نہیں تھا۔ ہزاروں روپے کے مزید صرفے کے بعد کراچی سے کاغذ لایا گیا۔ اور اس پر کمپوز کر کے مقالہ پیش کیا گیا۔ یہ عمل مقالہ لکھنے سے زیادہ گراں اور محنت طلب ثابت ہوا۔

اس طرح کے اعتراضات تمام مقالات پر نہیں کیے جاتے جس کے نتیجے میں جامعات کو یکساں پیائش کے معیار کے مقالات فراہم نہیں ہوتے۔ لائبریریوں میں رکھے ہوئے ایسے مقالات پہلی نظر میں چھوٹے بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلے کا دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ اگرچہ کاغذ سفید اور ۷۰ گرام وزن کا کہہ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ مگر ایک ہی دکان دار سے ایک ہی پیکنگ میں خریدے گئے کاغذ کی رنگت، وزن اور موٹائی میں فرق ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے جلد بندی کے بعد ایک ہی مقالے کے تمام صفحات یکساں رنگت کے دکھائی نہیں دیتے ہیں، ہلکے گہرے رنگ کی کئی کاغذی پٹیاں ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کاغذ کی مختلف دبازت کی وجہ سے ایک تعداد کے صفحات رکھنے والے مقالات کی ضخامت بھی یکساں نہیں

دکھائی دیتی ہے۔اس قسم کے عیب یہاں جامعات کے ہر دوسرے مقالے میں نظر آتے ہیں۔جس میں محقق کا قصور نہیں ہوتا۔اس کی وجہ تجارت میں عمومی بددیانتی ہے جس کے چھینٹے مقالات پر بھی پڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جامعہ بلوچستان میں ۱۹۹۸ءتک پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالات پکی جلد بندی کے بعد پیش کیے جاتے تھے۔جلد کا رنگ سیاہ مقرر تھا۔مگر صورت حال یہ ہے کہ تمام مقالات کی جلد کا رنگ یکساں سیاہ نہیں ہے۔کوئی چارکول سیاہ ہے،کوئی کتھی مائل سیاہ ہے اور کوئی ان دونوں سے الگ سیاہ ہے۔اس سلسلے میں جب معلومات حاصل کی گئیں تو معلوم ہوا کہ جلد بندی کے لیے سال ہا سال بعد مقالات آتے ہیں۔اس عرصے میں پہلے والا ریگزین ختم ہو جاتا ہے۔جو جلد ساز قلیل مقدار میں رکھتے ہیں۔جب نئے ریگزین کی ضرورت ہوتی ہے تو جس قسم کا سیاہ ریگزین بازار میں موجود ہوتا ہے وہی جلد بندی میں استعمال کر لیا جاتا ہے۔اگرچہ پہلے اور بعد کے رنگوں میں امتیاز ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ سیاہ کے ہی زمرے میں آتے ہیں۔بدنظمی کی یہ صورت اس وقت اور خراب ہو جاتی ہے،جب جلد بندی کرتے وقت جلد ساز مقالے کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے اس کے کناروں کی تراش خراش کرتے ہیں۔اس عمل کا کوئی پیمانہ نہ ہونے کی وجہ سے بھی مقالات چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔علاوہ ازیں دوران جلد بندی صفحات کی ترتیب کی الٹ پلٹ اور صفحات کو الٹا جوڑنے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔جس کے باعث محقق بار بار مالی اصراف اور ذہنی پریشانی سے گزرتا ہے۔اس عیب کو ختم کرنے کے لیے جامعہ بلوچستان نے اکیسویں صدی کے آغاز میں اپنے قواعد میں تبدیلی کر کے پکی جلد کی بجائے اسپائرل بائنڈنگ میں مقالات فراہم کرنے کی شرط عائد کر دی۔جس کے بعد مقالات کی جلد بندی میں عدم یکسانیت کا عمل مفقود ہوتا جا رہا ہے۔مگر جلد بندی کے اس انداز سے مقالے کی زندگی کم ہو جاتی ہے۔کیوں کہ اس انداز کے مقالے جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مارکیٹ کے عوامل مقالات کی ظاہری ہیئت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔جس سے پیدا ہونے والی خرابی کا تعلق مقالہ نگار سے نہیں ہوتا۔مگر یہ گڑبڑ بھی مقالہ نگار کے کھاتے میں جاتی ہے۔

اسی طرح کا معاملہ مقالات کے مجموعی حجم کا بھی ہے۔اصولاً تو ایم فل کے مقالات کو چند صفحات کے استثنیٰ سے قریب قریب یکساں حجم کا ہونا چاہیے۔تاکہ وہ بادی النظر میں ہی ایم فل کے مقالات دکھائی دیں۔مگر اسے کیا کہیے کہ کوئی دو مقالے یکساں حجم کے نہیں ہیں۔یہ عمل اس بات کا غماز ہے کہ مقالہ نگاروں کو سختی کے ساتھ کسی طے شدہ حجم کا پابند نہیں بنایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں جامعہ کے قوانین بھی رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔دوسری جانب موضوعات کا انتخاب ان کی ضخامت میں فرق ڈال دیتا ہے۔یعنی موضوعات اپنے انتخاب کے وقت سے ہی اس خرابی کے حامل ہوتے کہ وہ عام تناسب سے زیادہ ضخیم یا کم حجم کے حامل

ہوں گے۔ مقالہ نگاروں کا اسلوب بیان بھی اس کا باعث بنتا ہے۔ کچھ مختصر نویس ہوتے ہیں کہ مقالے بہت ہی سکڑے سکڑائے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ تفصیلاً لکھنے کو ہی باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ مقالہ نگاری بالکل مختلف مشق کا نام ہے۔ جس کے اپنے ہی قاعدے ہیں۔ سمجھ دار مقالہ نگار کتب تحقیق کے مطالعے یا نگراں کی رہ نمائی حاصل کر کے ضخامت کو قابو میں رکھنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں۔ کچھ سیکھنے کے باوجود عملاً اس بات کا خیال رکھنے میں ایسی مہارت کے حامل نہیں ہوتے کہ مقالات کے حجم کو قابو میں رکھ سکیں۔ جب کہ چند ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں صرف لکھنے سے غرض ہوتی ہے۔ وہ جمع شدہ کل مواد کو آگے پیچھے جوڑ دینے کو ہی مقالہ نویسی سمجھ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یا تو نگراں سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی اگر ہوتی ہے تو مقالہ نگار اتنی توجہ نہیں کر پاتا جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

جامعہ بلوچستان کے برعکس دیگر جامعات میں مقالات کی صوری کیفیت نسبتاً بہتر ہے مگر اسے بھی مثالی نہیں کہا جا سکتا۔ جلد کی رنگت کے فرق کا توڑ، اسپائرل بائنڈنگ ہے۔ مستقبل میں اس سے بہتر کوئی طریقہ دریافت ہو جائے تو اس پر عمل درآمد کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ ضخامت کا مسئلہ تمام جامعات میں یکساں ہے۔ اس سلسلے میں پاکستانی جامعات کے شعبہ اردو باہمی روابط کے ذریعے ایسے اصول وضع کر سکتے ہیں جو مستقبل میں اس کجی پر قابو پانے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ مقالات میں ایک نئی بدعت نے جنم لیا ہے۔ وہ یہ کہ ابتدائی صفحہ یا صفحات اور ہر باب کا صفحہ اول رنگین لگایا جانے لگا ہے۔ مقالہ نگاروں کے بقول یہ خوب صورت لگتا ہے۔ مگر انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر ایک مقالہ نگار صفحات کو اپنی اپنی پسند کے رنگ سے مزین کرے گا تو صفحات کی رنگا رنگی کہاں تک جائے گی؟ حالانکہ کسی بھی جامعہ کے قواعد میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے باوجود مقالات پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں محقق، نگران، شعبہ اردو، شعبہ جاتی کمیٹی برائے تحقیق، شعبہ جاتی بورڈ آف اسٹڈیز، بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ اور اکیڈمک کونسل کو اتفاق رائے سے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس قسم کی خواہشات سے مقالات کو آلودہ ہونے سے بچایا جا سکے۔

مقالات کے معیار کا دوسرا بڑا حصہ اصول تحقیق کے عملی اطلاق کا ہے۔ مقالات میں ابواب کی تعداد یکساں نہیں ہے۔ حالانکہ یہ طے شدہ اصول ہے کہ ایک ہی سند کے لیے لکھے جانے والے مقالات میں ابواب کی تعداد ہی نہیں ہر باب میں فصول کی تعداد بھی یکساں ہی ہو۔ تاکہ مقالات کے مجموعی حجم کی بے راہ روی پر قابو پایا جا سکے۔ بیسویں صدی میں لکھے جانے والے مقالات میں یہ خرابی عام طور پر موجود ہے۔ کسی مقالے میں آٹھ ابواب ہیں تو کسی میں چار۔ البتہ وہ مقالات تعداد میں زیادہ ہیں جن کے ابواب کی تعداد پانچ اور ہر باب میں فصول کی تعداد چار یا پانچ ہے۔ ایسے مقالات بیسویں صدی کے آخری عشرے میں زیادہ تعداد

میں لکھے جانے شروع ہوئے ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعداد ابواب کے بارے میں مقالہ نگاروں اور نگران حضرات میں ذہنی ہم آہنگی ہوتی جارہی ہے لیکن اس پہلو پر مضبوط گرفت اس وقت ہوسکتی ہے جب جامعات اس سلسلے میں اصول وضع کر کے ان پر عمل درآمد کرائیں۔کیوں کہ اکیسویں صدی میں بھی ابواب کی تعداد میں انتشار کم کم سہی مگر موجود ہے۔حد تو یہ ہے کہ ایک ہی جامعہ کے ایک ہی زمانے میں لکھے گئے مقالات میں بھی یہ عدم یکسانیت پائی جاتی ہے۔جس طرح مغرب میں تعداد ابواب کے اصول وضع کر کے یہ واضح کردیا گیا ہے کہ ہر باب کی ترتیب وار ارتقائی صورت کیا ہونا چاہئے؟ اسی طرح اردو مقالات کے لیے بھی جامعات کو رہنمائی فراہم کرنا ضروری ہے۔بلوچستان کی جامعات میں ایس کے بی وومنز یونیورسٹی نے یہ کام کیا ہے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے اقدامات بھی تجویز کیے ہیں۔وقت کے ساتھ ان میں مزید بہتری لائی جاسکتی ہے۔تمام جامعات میں ایک ہی جیسے اصول وضع کر لیے جائیں تو صورت حال متوازن ہوجائے گی۔

مقالات کی غالب تعداد اس بات کا تعین نہیں کرتی کہ ان کے لکھے جانے کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ وہ کون سا ادبی یا علمی مسئلہ تھا جس کے حل کے لیے مقالات لکھے گئے ہیں؟ اگر کسی مسئلے کی کہیں اشارتاً نشان دہی ہو بھی گئی ہے تو بھی مقالات کے حرف بہ حرف مطالعے کے بعد بھی یہ نتیجہ سامنے نہیں آتا کہ اس کا کیا حل تجویز کیا گیا ہے؟ اس سلسلے کا سب سے کم زور پہلو یہ ہے کہ سابقہ مطالعات کی تفصیل فراہم کرنے کی روایت بہت کم زور ہے۔یوں مقالات اس سائنسی انداز کی تحقیق سے عاری ہیں جسے آج کی تحقیق کا جزو لازم قرار دیا جاتا ہے۔اس بارے میں ضروری ہے کہ تحقیقی تجویز اور خاکے میں سابقہ مطالعات کی فراہمی کو ضروری قرار دیا جائے۔اس کے بعد ہی مقالہ نگاروں کو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ جو کام دوسرے کر چکے ہیں اسے، اس کے آگے سے اپنا تحقیقی سفر شروع کرنا ہے۔جس سے مختلف مقالات میں ایک ہی بات کو بار بار بیان کرنے کا عمل رک سکتا ہے۔فی الوقت ایس بی کے وومنز یونیورسٹی میں یہ کام کیا جارہا ہے۔جامعہ بلوچستان میں بھی ایسے ہی اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔یہ عمل ایم اے کے مقالات سے شروع کر کے اعلیٰ سندی مدارج تک بڑھایا جائے تو محققین کو اس کی خاطر خواہ مشق ہوجائے گی۔وہ اس کو اپنے مقالات کا لازمی جزو سمجھ کر تحقیق کی جدید راہوں پر گامزن ہوجائیں گے۔یوں مقالات کے معیارات کے بارے میں متعلقہ سوالات بھی مفقود ہوجائیں گے۔اس طرح مقالہ نگاری کا صبر آزما، محنت طلب کام اپنا اجر بھی حاصل کر لے گا۔

نئی معلومات تک رسائی کا عمل اکیسویں صدی میں نسبتاً بہتر انداز میں شروع ہوا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عرصے میں تحقیق اور مبادیات تحقیق کی بہت سی کتب سامنے آئی ہیں۔جن میں اردو کے نام ور اور

مستند محققین نے تحقیق کے مباحث پر قلم اٹھاتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ تحقیق نئی معلومات تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ جس سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محققین کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوتی جارہی ہے کہ یہی وہ پہلو ہے جسے تحقیق کا بڑا منشا قرار دیا گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس میدان کو اپنانے کا عمل تیز ہو گیا ہے۔ اب نگراں حضرات بھی مقالہ نگاروں سے سوال کرنے لگے ہیں کہ کون کون سی نئی معلومات مقالے کے توسط سے سامنے آئی ہیں؟ اس کا درست جواب اسی وقت ممکن ہے جب کام کی نوعیت اسی اصول پر استوار کی گئی ہو۔ اگرچہ تحقیق کا یہ پہلو انتہائی دقت نظری کا مطالبہ کرتا ہے۔ مگر جب محقق اس پر آمادہ ہو جائے تو اس خاردار راہ گزر سے سلامت گزر آتا ہے۔

نئی معلومات کا معیار اور اس کی سند کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ طریق تحقیق ہی ایسا پیمانہ ہے جس سے مقالہ نویسی کا عمل اپنا اعتبار قائم کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر مقالہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس کے نتائج کو نہ صرف تسلیم کیا جائے بلکہ انھیں عام بھی کیا جائے۔ تا کہ صحت معلومات کے ساتھ نئی معلومات کا فروغ ہو سکے۔ اور ادب کے طالب علموں کو اس سے درست طور پر استفادے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ اس پورے پس منظر میں دریافتوں کا عمل تا حال مفقود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے اہل تحقیق اس پہلو پر بھی توجہ دیں۔ کیوں کہ ابھی بہت سا ادبی سرمایہ بلوچستان کے دور دراز کے نجی کتب خانوں میں یا گھروں میں بند پڑا ہے۔ عام حالات میں جن تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہ مستقبل کے مقالہ نگاروں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ جہاں تک رسائی حاصل کر سکیں، وہاں پہنچیں اور اس مسئلے کو موثر طور پر حل کرنے کی داغ بیل ڈال کر رہ نمائی کا فریضہ ادا کریں۔

بعض مقالات میں مواد کی تکرار بھی مطالعے کا لطف کرکرا کرتی ہے۔ اس کی صحت کے لیے بعض نگراں نشان دہی کر کے درستی کروا لیتے ہیں اور بعض چشم پوشی اختیار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مقالہ محنت کے باوجود وہ تاثر قائم نہیں کر سکتا جو اچھی تحقیق کا خاصہ ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کو اس کے لیے اپنے تمام ابواب کے بار بار کے مطالعے سے گزرنا چاہیے تا کہ ان کی نظر اس خامی پر پڑ سکے۔ یوں ضروری مواد کو ایک موزوں مقام پر رکھ کر اس عیب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ چند مقالات ایسے بھی نظر سے گزرے ہیں جن میں پہلے سے موجود مواد کو مقالہ نگاروں نے جستہ جستہ جملوں کی پیوند کاری سے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ مواد انھیں کا لگے۔ لیکن اسلوب، ذخیرہ الفاظ، لہجہ، معنی آفرینی اور جملوں کی ساخت سے نقل نویسی فوراً پکڑی جاتی ہے اور وہ ماخذات تلاش کر لینے میں مشکل پیش نہیں آتی جن کا مواد مقالات کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ایسے مقالات کا تناسب بہت کم ہے لیکن ان کی موجودگی ہی اس آزردگی کا باعث ہے کہ وہ حضرات جو لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، محنت

بھی شیوہ ہے، فکری صلاحیتوں سے بھی بہرہ مند ہیں؛ وہ اپنی تحقیق کو اس طرح آلودہ کیوں کرتے ہیں۔

بلوچستان کے سندی مقالات کی بھاری اکثریت میں نہ تو کہیں فرضیہ پیش کیا جاتا ہے اور نہ ہی اسے ثابت کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ادبی تحقیق میں فرضیہ کے بارے میں متضاد آرا ہیں۔ ایک مکتبہ فکر ایسا ہے جو اس کے ہونے سے ہی متفق نہیں ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے نسرین زہرا لکھتی ہیں:

> ''اسلام آباد میں اردو اور فارسی کے ایک معروف استاد نے جو ماشاءاللہ آج بھی سینکڑوں تحقیق کاروں کے مشیر اور رہنما ہیں ایک بار کہا تھا کہ فرضیات یعنی Hypotheses کا گزر اردو تحقیق میں ممکن نہیں۔ پھر پچھلے دنوں جب یہی بات اپنے قریبی پروفیسر سے سنی کہ ادبی تحقیق میں تو فرضیہ قائم ہی نہیں ہو سکتا تب بھی شاید اچنبھانہ ہوا کہ اردو میں ویسے بھی اصول تحقیق کا ابھی گزر کہاں ہوا ہے اور ''سرانڈپیت'' تو اردو میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ آپ ذرا گیان چند کو ملاحظہ کریں۔ انھوں نے ''تحقیق کا فن'' ۱۹۹۴ء میں فرضیے پر کوئی باب دینا پسند نہیں کیا۔'' ۲۷

ایک طبقہ وہ بھی ہے جو ادبی تحقیق میں فرضیے کو تحقیق کی بنیاد سمجھتا ہے۔ ان میں دورِ حاضر کے وہ تمام محقق اور اساتذہ شامل ہیں جن کی جدید رسمیات تحقیق پر گہری نظر ہے۔ جدید ادبی تحقیق کے تقاضے بھی یہی ہیں۔ سابقہ مطالعات میں ایسی ہی بنیادی کمزوریوں نے اردو کی ادبی تحقیق کو کم رتبہ کیا ہے۔ بلوچستان میں بھی اصول تحقیق کے اطلاق کا معاملہ زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔

جامعات میں امتحان کے لیے پیش کیے جانے والے مقالات کے لیے جزوی یا مکمل ضوابط ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ جن سے مقالات کی ظاہری اور معنوی کیفیات کو متعین کیا جاتا ہے۔ تاکہ مقالات کے تحقیقی عوامل میں یکسانیت قائم رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی سہولیات اور مسلمہ اصول تحقیق میں بھی جزوی تبدیلیاں اس طرح واقع ہوتی ہیں، کہ چند عشروں بعد وہ مقالات بھی کمزوریوں کا شکار نظر آنے لگتے ہیں جو اپنے عہد میں معیار تحقیق کے نمائندہ قرار دیئے جاتے تھے۔ مختلف جامعات کے مقالات میں عدم یکسانیت تو اس لیے بھی گوارا ہے کہ ہر جامعہ کے اپنے اپنے اصول ہوتے ہیں جو کہیں کہیں مماثل اور کہیں کہیں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایک ہی جامعہ میں اگر مکمل شدہ مقالات میں یکسانیت نہ ہو تو اسے کچھ تو جامعات کی سندی تحقیق پر کم زور گرفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ کچھ وہ سہولیات ہیں جو ایک وقت میں فراہم نہیں تھیں اور بعد میں فراہم ہو گئیں۔ جس سے مقالات کی ظاہری کیفیات میں ردوبدل وجود میں آ گیا۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ اس نوع کا محاکمہ کرتے ہوئے اس عہد کے تقاضوں کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔ اصول وضوابط موجود ہونے کے باوجود مقالات کی کتابت، کمپوزنگ، اور ٹائپ کاری کا تعلق قواعد کے برعکس اس وقت کی موجود سہولیات سے ہے۔ جس کی وجہ سے مقالات کو عدم یکسانیت سے کلی طور پر بچانا ممکن نہیں رہتا۔ مستقبل

میں کوئی اور اختراع وایجاد اس صورت کو بدل دے گی جو آج قائم ہے۔اس وقت یہ تضاد اور بھی بڑھ جائے گا۔ مقالات کے طول وعرض میں مماثلت بھی موجود ہے اور عدم مماثلت کے نمونے بھی ہیں۔ بالخصوص ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں لکھے جانے والے بعض مقالات A-4 کاغذ پر بھی ہیں اور A-5 کاغذ پر بھی۔کاغذ بھی ۷۰ گرام وزن اور سفید ہونے کے بجائے ریڈیو بونڈ یا اس جیسا ہے۔رنگ بھی سفید نہیں بلکہ سفید کے قریب ہے۔ یہ تبدیلی وقت گزرنے سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ کاغذ کی اصل رنگت ہی ایسی ہے۔ یعنی رسم کتابت ہی نہیں، کاغذ کا انتخاب، جلد بندی کا امتیاز، طول وعرض کی پیائش میں اختلاف اور سرورق میں بھی فرق ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جامعات نے انہیں قبول کر کے کامیابی کی سند عطا کر دی تھی۔ اس لیے وہ جامعات کے اس وقت کے معیار کے مطابق تھے۔یا اس کے قریب قریب تھے۔

اکیسویں صدی میں اس سلسلے کی ایک اور عدم مماثلت یہ ہے کہ متن کی کمپوزنگ، بین السطور فاصلے اور فونٹ کی موٹائی کے لیے کسی ایک اصول کو نہیں برتا گیا ہے۔اسی طرح اقتباس درج کرنے کا بھی کوئی ایک اصول کارفرما نظر نہیں آتا ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ اقتباس کو نمایاں کرنے کے لیے متن کے برعکس دائیں بائیں خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔لیکن یہ کتنی ہو؟ یہ معین نہیں ہے۔ دونوں جانب ایک انچ، سوا انچ اور ڈیڑھ انچ یعنی کمپوزر کا جس قدر جی چاہا اتنی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ جب دو سے زیادہ مقالات کو تقابل میں رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو یہ عیب نمایاں ہو کر اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ جامعات نے اس سلسلے کے اصولوں پر سختی سے عمل درآمد کو ضروری نہیں سمجھا ہے۔اس معاملے کو نگراں اور شعبہ اردو کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔اقتباس نمبر کہاں لگایا جائے؟ یہ بھی واضح نہیں ہے۔اصولاً اقتباس کے اختتام پر واوین سے قدرے دوری پر اس لیے لگانا چاہیے کہ قاری مکمل اقتباس پڑھ کر ماخذ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے تو نمبر کے ماتحت معلومات حاصل کر لے۔اقتباس کے شروع میں بھی حوالہ نمبر لگائے جاتے ہیں۔اقتباس پڑھنے سے پہلے حوالہ نمبر کا اس پس منظر میں کوئی جواز نہیں ہے۔اس طرح بنیادی سرخیوں، ذیلی سرخیوں اور بغلی سرخیوں کے لیے الگ الگ فونٹ کی تمیز نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے سرخیاں ممیّز ہو کر اپنی شناخت آپ بننے کی صفات سے آراستہ نہیں ہیں۔نیز یہ اصول بھی اس طرح کارفرما نظر نہیں آتا جس طرح کہ اس کی روح ہے کہ سرخیاں کب، کہاں اور کس قدر ہونی چاہیں۔متن کے اندر حصص کے نمبر درج کرنے میں بھی عدم یکسانیت کے امور موجود ہیں۔ فصول کے نمبر، ذیلی سرخیوں کے ماتحت آنے والے نمبر اور بغلی سرخیوں کے ماتحت آنے والے نمبر بھی ایسے ہی انتشار کا شکار رہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مقالہ کی تسوید کے وقت ان امور کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔اکیسویں صدی کے اب تک کے آخری مقالات میں یہ بدعت قدرے قابو میں آتی دکھائی دیتی ہے۔ جو

اس بات کی غماز ہے کہ عمل تحقیق اپنے اصول کی طرف تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے۔

پاکستان کے اہم علمی مراکز کی طرح بلوچستان میں بھی ذاتی دل چسپی اور شوق پر مبنی اردو کی ادبی تحقیق کی مقدار بہت کم ہے۔ تحقیق کا زیادہ بوجھ یا تو یہاں کی جامعات نے اٹھا رکھا ہے یا پھر بلوچستان سے باہر کی جامعات نے اس خدمت کے لیے بلوچستان کے محققین کو دعوت تحقیق دی ہے۔ جس کا فائدہ اٹھا کر ان محققین نے اس خطے کے تحقیقی، ادبی اور علمی افتخار کو دوبالا کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے رسمیات تحقیق، اردو کی ادبی تحقیق کے مسائل، اردو کی ادبی تحقیق کے معیار اور اردو کی ادبی تحقیق کی سمت متعین کرنے میں جو بھی مواد سامنے آیا ہے۔ اس کا بڑا حصہ، اردو تحقیق کی تحقیر اور اسے کم رتبہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے آج اردو کا محقق ذہنی سطح پر ہی نہیں، تحقیقی سطح پر بھی پریشان ہے کہ وہ ایسا کیا کام کرے جس سے اس کی تحقیق کم مایہ ہونے سے بچ رہے؟ کیوں کہ جو ماہر اور مشاق اساتذہ عصر حاضر میں اردو کے محققین کی رہنمائی میں آگے آگے ہیں۔ ان کی ادبی تحقیقات بھی انہیں کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق باعث افتخار نہیں ہیں۔ اس صورت میں وہ کون سے مثالی نمونے ہیں جن کی پیروی میں آگے بڑھا جا سکتا ہے؟ جن نمونوں کی نشان دہی کی جاتی ہے، باریک بینی سے ان کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ڈھالے گئے معیارات کی تکمیل کی بجائے پسند و ناپسند کی ذاتی اغراض کی تشفی کے لیے سامنے لائے گئے ہیں۔ اسی طرح جن کاموں کے معیار کی نفی کی جاتی ہے، ان کے پس پردہ عوامل بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اس سلسلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جامعاتی سطح پر ہونے والی تحقیق کو کسی طور قابل اعتنا نہیں سمجھا جا رہا ہے۔ نت نئے معیارات قائم کر کے اہل تحقیق کی حوصلہ شکنی کرنے کی کوششیں مزبوط انداز میں، اس طرح خاموشی اور ڈھکے چھپے طریقے سے ہو رہی ہیں، جس طرح پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دیے جانے کے باوجود اس کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی رہی ہیں۔ اسے انگریزی سے پیچھے دھکیلنے کی سرکاری اداروں بالخصوص ایچ ای سی کی جانب سے تواتر کے ساتھ کوششیں جاری ہیں۔ اس بحث سے یہ حقیقت ابھارنا مقصود ہے کہ کسی بھی شعبے میں ترقی کی آرزو اچھی ہے مگر ماضی کی خدمات کو حرف غلط کی طرح مٹا کر راتوں رات انقلاب کی نوید سنانا بھی کوئی وزن نہیں رکھتی ہے۔ علوم بالخصوص تحقیق میں منہاج تدریجی عمل ہے۔ اس کے لیے پہلے مزاج اور میلان کی تعمیر، علمی ماحول کی فراہمی اور سہولیات و مراعات کی پیش کش بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد عملی تحقیق کے وہ مراحل اور عوامل ہیں جن کی تعلیمی اداروں میں ہر سطح پر تکمیل ہونا چاہیے۔ ان تمام بنیادی تیاریوں کی فراہمی کے بغیر غیبی تبدیلی کی توقع عبث ہی رہے گی۔ اس بارے میں مفید ترین اصول یہ ہے کہ ماضی کی سندی تحقیق کو معاصر تحقیق کے ان معیارات پر پرکھنا چاہیے جو اردو کی ادبی تحقیق کے متعلقہ دور

میں رائج تھیں۔ جامعات جس مقالے کو سند قبولیت عطا کر دیتی ہیں ان میں باہمی طور پر معیار بندی کا فرق ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ کیوں کہ ہر موضوع اپنے طریق تحقیق کو خود وضع کرتا ہے۔ مقالہ نویسی کے اصول تو معین اور موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے موضوع پر تحقیق کے اصول خود متعین کر کے ان پر عمل درآمد کرنے سے ہی کام آگے بڑھتا ہے۔ اسی لیے ہر مقالہ معیارات تحقیق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مسلمہ اصول اور خود متعین کردہ سمتوں کے انجذاب سے طریق تحقیق اور اصول تحقیق کی وہ فضا تیار ہوتی ہے جو پیش رو مقالات ہی سے نہیں معاصر مقالات سے بھی مختلف ہوتی ہے۔ معیار تحقیق میں جزئیات پر نگاہ ڈالنے سے زیادہ مفید یہ عمل ہے کہ مقالات کے توسط سے جانچا جائے کہ مقالات میں کس ادبی مسئلے کا کلی یا جزوی حل تلاش کیا گیا ہے؟ وہ کون سے نکات ہیں جو معلومات کی صحت میں اضافہ کرتے ہیں؟ وہ کون سے ادبی سوالات ہیں جو مقالے میں اٹھائے گئے ہیں؟ جن کے ذریعے تحقیق مزید کی دعوت دی گئی ہے؟ مطالعہ میں یہ پہلو بھی واشگاف ہوا ہے کہ ایک جیسے موضوعات تحقیق میں بھی ایسے نئے نکات فراہم ہو جاتے ہیں جو انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جن پر کسی اور کی نگاہ نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس لیے جن نت نئے رہنما اصولوں کی بھرمار جاری ہے، جب تک جامعات کی سطح پر ان کی پذیرائی سے ہم آہنگی اور یک رنگی کی فضا پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک اردو کی ادبی تحقیق میں جو جو کام ہوئے ہیں، ہو رہے ہیں اور ہوں گے، قابل ستائش ہیں۔ تحقیقی عمل انتہائی اور فرسودہ حالات کار کے باوجود کسی نہ کسی طور جاری ہے۔ اسی بنیاد پر بلوچستان کے محققین کے مقالات کے معیار کا مطالعہ مفید اور حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔ تحقیق کا جو بوجھ جامعات کے حصے میں آیا ہے وہ اسے اپنے محدود وسائل کے باوجود اٹھائے چلی آ رہی ہیں۔ جامعات کی اس صورت حال پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عظمیٰ فرمان فاروقی لکھتی ہیں:

> "تحقیق کا عملی طور پر تمام بوجھ جامعات پر ہے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جامعات میں جو کام ہو رہا ہے وہ بے وقعت یا بے حقیقت ہے۔۔۔ اردو تحقیق کے لیے وسائل بہت محدود ہیں تو دوسری طرف سلیقے کی بھی کمی ہے۔ ہماری جامعات میں نہ کوئی رابطہ ہے نہ کوئی اچھا مشترکہ پروگرام ہے اور نہ ہی مقالہ لکھنے اور تحقیق کرنے کے اصول سائنٹیفک بنیادوں پر مقرر ہو سکے ہیں" ۸

بلوچستان میں اردو کے محققین کی صورت حال اور بھی تشویش ناک ہے۔ یہاں ایسے بنیادی وسائل ہی موجود نہیں ہیں جو محققین کی ابتدائی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوں۔ ہر محقق کو تحقیق کے عمل سے گزرتے ہوئے پورے پاکستان کے سالہا سال دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ بنیادی مسالا فراہم ہوتا ہے کہ مقالے کے ابواب کا ابتدائی مسودہ تیار ہو سکے۔ ان کڑے مراحل سے گزرنے میں جس قدر وسیع مادی

وسائل صرف ہوتے ہیں ان کا تخمینہ لاکھوں روپے میں پہنچتا ہے۔ جس کا بوجھ اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ تب کہیں جا کر مقالہ مکمل ہوتا ہے۔ اس دگرگوں صورت حال کے باوجود وسائل کی فراہمی پر کسی کی توجہ نہیں ہے۔ جس سے اس بات کا امکان واضح ہے کہ بلوچستان میں اردو کی ادبی تحقیق کا محقق، مستقبل بعید تک، سندی اور غیر سندی دونوں طرز کی تحقیق کے لئے ان کڑے، صبر آزما مراحل سے گزرتا رہے گا۔ پھر اپنے مالی، مادی اور جسمانی وسائل لٹا کر ایسا مقالہ لکھے گا جس کی ستائش کے لیے اسے دوسروں کے منہ بار بار دیکھنا پڑیں گے۔ اسے تکمیل مقالہ کے بعد مدتوں اس بات کی استطاعت نہیں ہوسکے گی کہ اس کے مقالے کی اشاعت ہی کا کوئی سامان ہوسکے۔ تا کہ اس کے مطالعے سے استفادے کا دائرہ کار وسیع ہوسکے۔

یہاں کے جن محققین نے پی ایچ ڈی کی سطح پر ترک مقالہ کا کڑوا گھونٹ پیا ہے، وہ ایسے نادیدہ مسائل تھے جن کا ان کے پاس کوئی حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے انہیں اس وقت ہتھیار ڈالنا پڑے جب ان کے مقالات تکمیل کے قریب تھے۔ یوں یہاں کے محققین نے اپنے آپ کو محقق کے ان اوصاف سے مزین کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ جو اردو تحقیق کے اساتذہ نے تواتر کے ساتھ وضع کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ آگہی بھی حاصل کی ہے کہ ان میں تحقیق کا کتنا ذوق ہے؟ یہ اسی وقت کھلتا ہے جب کوئی عملاً اس میدان میں داخل ہوتا ہے۔ اسی سے اس کی طبع تحقیق کے جوہر کھلتے ہیں۔ تب ہی وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ صابر، شاکر، سچائی کا متلاشی، حقائق کا کھوج لگانے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔ نازک علمی نکات کو احاطہ تحریر کی گرفت میں لانے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ ایسا لکھاری ہے جو اپنے خطے کے تہذیبی، علمی اور لسانی عوامل کو اردو میں منعکس کرتے ہوئے، مرتب اور منضبط انداز میں نتیجہ خیزی کا ملکہ رکھتا ہے۔ محققین نے مقالات کی تکمیل کر کے اس بات کو منوالیا ہے کہ وہ امور تحقیق پر حاوی ہو کر خود کو ان محققین میں شامل کرانے کا شعور رکھتے ہیں جن کے کام سے اردو کی ادبی تحقیق باوقار ہوتی ہے۔

بلوچستان کے محققین کا ایک خصوصی وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے ساتھ کئی اور زبانوں پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ جس سے تحقیق کے بنیادی مطالبے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس سلسلے کا وہ منفی پہلو جو بہت ابھرتا ہے، دوران تحقیق میں اور تحقیق کی تکمیل کے بعد بعض محققین میں رعونت کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ اہل تحقیق وقت کے ساتھ ساتھ منکسر المزاج ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق کا تقاضا بھی ہے۔ ایسے محقق عمل تحقیق میں اس وقت رکاوٹ بن جاتے ہیں جب وہ اپنے پاس محفوظ بنیادی ماخذات دوسروں سے چھپاتے ہیں یا اس سلسلے میں دوسروں کی اس لیے کوئی رہ نمائی نہیں کرتے کہ وہ سندی تحقیق میں کام یابی سے گزر کر ان کے ہم پلہ نہ ہوجائیں۔ اس طرح کی عدم معاونت سے ہر محقق کو بار بار گزرنا پڑتا ہے۔ جس سے کوئی

ایک گزر کر ادبی اثاثہ اپنے پاس محفوظ کر چکا ہوتا ہے۔ اس کے پس منظر میں متعلقہ محققین کی رائے یہ ہوتی ہے کہ ''جب ہم نے اتنی خواری جھیلی ہے تو دوسرے کیوں نہ جھیلیں۔'' اس روش سے ادبی اور تحقیقی ماخذات تک رسائی ہمیشہ مشکل ہی رہتی ہے۔ کچھ محققین ایسے بھی ہیں جو نادر اور کم یاب ماخذات کو اس غرض سے چھپا کر رکھتے ہیں کہ وہ اس پر مزید کام کریں گے۔ لیکن نہ وہ خود کچھ کرتے ہیں نہ کسی دوسرے کو اس سے مستفید ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ یوں بہت سے ایسے ذخائر پر وقت کی گرد بیٹھتی چلی جا رہی ہے جو بلوچستان میں اردو کی ادبی تاریخ کے اہم ماخذات ہیں۔ ایسے افراد کے پہلو بہ پہلو وہ محقق بھی ہیں جو اپنے ذخیرے سے ہر قسم کا مواد دوسروں کو دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مواد کی نقول کی تیاری کے مصارف بھی خود برداشت کرتے ہیں۔ مگر فروغ تحقیق اور علم کے لیے کسی بخل سے کام نہیں لیتے۔ اس سلسلے کے اہم نام ڈاکٹر انعام الحق کوثر، پروفیسر انور رومان اور ڈاکٹر ضیا الرحمٰن کے ہیں۔ یہ اساتذہ موضوع سے آگہی کے بعد وہ بنیادی ماخذات بھی فراہم کر دیتے ہیں جو ان کے پاس ہوں اور جس کا تقاضا تک نہ کیا گیا ہو۔ مگر ان کے علم کے مطابق، متعلقہ تحقیق میں مفید ثابت ہو سکتے ہوں۔ دیگر بلوچستانی محققین کو بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تحقیق اور اردو کی ادبی تحقیق کو فروغ حاصل ہو۔ یہ فائدہ صرف بلوچستان تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کی لہریں دور دور تک پھیلیں گی۔ بہ ظاہر یہ رویہ فوری طور پر تبدیل ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ مگر یہاں ایسے اساتذہ موجود ہیں جو ماخذات کی فراہمی کی تبلیغ میں ہمہ وقت مصروف نظر آتے ہیں۔

بلوچستان میں اب تک ایک محقق کے سوا کسی پر سرقے یا چربے کا الزام نہیں لگا ہے۔ اگرچہ ادبی تحقیق میں ہی نہیں ہر قسم کی تحقیق میں یہ وبا عام ہے۔ جس پر گرفت کے لیے کمپیوٹر سافٹ ویر تیار کر لیے گئے ہیں جو مقالے کو جانچ کے یہ بتا دیتے ہیں کہ مقالے میں کتنے فی صد سرقہ ہے۔ اس سرقے کا اس طرز کے محققین نے یہ توڑ نکالا ہے کہ مواد سرقہ ہی ہو مگر زبان، ذخیرہ الفاظ، جملوں کی ساخت اور ترتیب کو بدل دیا جائے۔ یوں سرقہ شدہ مواد پکڑ میں نہیں آتا ہے۔ اسی لیے بعض علوم کے نام ور اساتذہ بھی اس کاری گری سے سرقے کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ بلوچستان میں اردو کی تحقیقی روش نے اس صورت حال کو اس طرح قابو میں رکھا ہے کہ موضوعات کی ساخت اور نوعیت ایسی ہو کہ سرقے کا گزر ہی نہ ہو سکے۔ اور محقق کو سب کچھ خود ہی کرنا پڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں نگران کا عمل دخل بہت ہی سخت اور مضبوط ہے۔ نگران حضرات مقالے کے مسودات کا خود مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی حصہ یا پیراگراف چربہ یا قریب الچربہ نظر آتا ہے تو اسے قلم زد ہی نہیں کرتے بلکہ محقق کو ان کی جلی کٹی سن کر ان کے عتاب سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ بعض نگران تو اس قدر کثیر المطالعہ ہیں کہ مذکورہ حصوں کی نشان دہی کر کے ان ماخذات کا درست حوالہ بھی فراہم کر دیتے ہیں جن

سے سرقہ کیا گیا ہو۔ یوں ایک مرتبہ سرقے کی ناکام کوشش کے بعد محقق اس عمل کی جرات ہی نہیں کرتا ہے۔ یہاں سرقہ کو روکنے کے لیے جو چھلنیاں موجود ہیں وہ اپنا کام بہ خوبی انجام دے رہی ہیں۔ بلوچستان کے محققین کی اکثریت جو یہاں کی ''تاریخ ادب'' کے تناظر میں کام کرتی ہے، ان کا موضوع کوئی بھی ہو، وہ مقالے کے پہلے باب میں بلوچستان میں اردو زبان وادب کی تاریخ سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ جو اگرچہ کلیتاً چربہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کی ترتیب، بنیادی نکات کی تفہیم پہلے سے موجود مواد سے مختلف ہوتی ہے لیکن کوئی نیا نکتہ نہ نکالنے کی وجہ سے سابقہ مواد جیسا ہوتا ہے۔ جو یکسانیت کی وجہ سے چربہ سے قریب کی چیز لگتی ہے۔ بیسویں صدی میں یہ عمل زیادہ تھا۔ کیوں کہ اس وقت تحقیقی تجاویز کی تعمیر ہی اس انداز میں کی جاتی تھی۔

اکیسویں صدی میں تحقیقی شعور اجاگر ہونے کی وجہ سے اب اس قسم کی تاریخ ابواب میں شامل کرنے کے رجحان میں کمی آ رہی ہے۔ نئے رجحانات کے تحت اصل موضوع سے تحقیقی خاکے میں ابواب بندی قائم کی جاتی ہے۔ یوں اس ذیل میں چربہ اور سرقہ سے ملتی جلتی روایت کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس قسم کی یکسانیت ان مقالات میں زیادہ تھی جن کا تعلق بلوچستان میں اردو کی ادبی تاریخ سے تھا۔ ان مقالات میں کلیات محمد حسن براہوی سے، مقالے کا آغاز کر کے یہاں اردو زبان وادب کے ارتقا کی تفصیلات فراہم کر دی جاتی تھیں۔ جن میں اکثر کوئی نئی معلومات یا نکتہ سامنے نہیں آتا تھا۔ اب اگر ایسا ضروری خیال بھی کیا جائے تو کسی نئے نکتے کو اجاگر کرنے کی کوشش ضرور کی جاتی ہے۔ اگر پہلے سے موجود بات کو پیش کرنا ضروری ہو جائے تو اصل اقتباس کو واوین میں لکھ کر تحقیقی لوازم کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یہ عمل بہ تدریج اس منہاج کو چھوڑ رہا ہے جس کا مطالبہ اردو کی ادبی تحقیق کرتی ہے۔ اس سلسلے میں انتخاب اقتباس کے معیارات پر توجہ زیادہ ہوگئی ہے۔ مستند بنیادی ماخذات سے اقتباسات اس طرح منتخب کیے جاتے ہیں کہ استدلال میں وزن پیدا ہو جائے۔ اور جو معلومات فراہم کی جا رہی ہیں ان کی سند مستحکم ہو جائے۔ یعنی تحقیقی عمل اپنے مدارج کی طرف بڑھ چکا ہے۔

ماضی کے پاورقی حوالے جو کبھی حواشی یا تعلیقات کے زمرے میں آتے تھے۔ ان کی وضاحت حوالے میں کہیں نہیں ہوتی تھی کہ وہ کیا ہیں؟ یہ قاری کی ذمہ داری سمجھ لی جاتی تھی کہ وہ خود اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ان کے درمیان امتیاز قائم کر لے۔ اب ''حوالہ، حواشی اور تعلیقات'' کی سرخی سے یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ اندراجات میں یہ تینوں عوامل شامل ہیں۔ اگر یہ تینوں نہ ہوں تو ان میں سے جو بھی ہوتا ہے، انھیں کی سرخی لگائی جاتی ہے۔ جس سے اہل مطالعہ کی رہ نمائی ہو جاتی ہے۔ ماضی میں طویل پاورقی حواشی مقالے کے کئی کئی صفحات گھیر کر اصل مقالے پر حاوی ہو جاتے تھے۔ اب حوالے، حواشی اور حسب ضرورت تعلیقات کا ہر باب کے اختتام پر اندراج کے انداز سے فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اندراج کا تعلق ان میں سے کس سے ہے؟

حوالوں میں ماخذات کے اندراج کے کئی طریقے یہاں رائج تھے۔ کسی ایک طریقے کو مثال سمجھ کر اس کی پیروی نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے مختلف مقالوں میں اندراج کا عمل مماثل نہیں ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ انتشار کم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کی ''رسمیات مقالہ نگاری'' کے طریقوں کو اپنایا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے حوالے پہلی نظر میں حواشی اور تعلیقات سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان دونوں کے معنی، مفہوم اور وجہ استعمال معین ہیں۔ یہ مراحل تحقیق بھی ان مدارج کی جانب آ گئے ہیں جن کا مطالبہ اردو کی ادبی تحقیق کر رہی ہے۔ البتہ کہیں کہیں کئی صفحات پر مشتمل طویل اقتباس بھی مل جاتے ہیں لیکن یہ اپنے سیاق و سباق سے اپنی ضرورت کو خود اجاگر کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں ہیں مگر کم ہیں۔ ابھی یہاں معین الدین عقیل کی مجوزہ رسمیات مشمولہ ''اردو تحقیق صورت حال اور تقاضے'' رائج العمل نہیں ہیں۔ اگر دوسرے بڑے تحقیقی مراکز میں انھیں اپنالیا گیا تو اس کے اثرات یہاں بھی مرتب ہوں گے۔

مقالہ نگاری میں اسلوب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اسلوب کی حدود و قیود اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ ہر ایک کا فطری اسلوب دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ جو اگر رہ نما معیارات کی حدود سے باہر ہو جائے تو مقالے کے مجموعی معیار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مقالہ نگار اس بات کی کوشش ضرور کرتا ہے کہ مقالے کا اسلوب باوقار رہے۔ مقالہ نگار کو مقالے کا آغاز کرنے سے پہلے اس بات کی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اردو کی ادبی تحقیق سے متعلق موجود مواد کا مطالعہ ضرور کرے۔ ان باتوں کا خیال رکھے جن کے ہونے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اور وہ سب کچھ نہ کرے جن کے نہ ہونے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ کچھ ضرور کرنے اور کچھ سے بچنے کی ہدایت سے محقق کا ذہن ایسا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے فطری اسلوب میں بہت سی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ عمل اس اصل اسلوب کو دبا کر مصنوعی اور ایسا اسلوب تیار کر دیتا ہے جو خود لکھنے والے کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔ یعنی وہ مطالعے کے دباؤ کے تحت اپنے انداز بیان کو زبان کے معیارات سے جوڑنے کی فکر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے عملاً ایسی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جو اس کی نظر میں غلطیاں نہیں ہوتیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ وہ انتہائی سنجیدہ ادبی اور علمی موضوع پر قلم اٹھا رہا ہے۔ جہاں عام زبان کا کوئی گزر نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے پوری احتیاط کے ساتھ استدلال سے کام لے کر نتائج کا استخراج کیا جاتا ہے۔ یہ سب اس طرح ہونا چاہیے کہ جلد اور آسان ابلاغ عمدگی کے ساتھ وجود میں آ جائے۔

بلوچستان کے محققین بھی اپنی اپنی سطح پر ان تمام امور کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان و بیان کی تعمیر اور اٹھان ایسی ہے کہ یہاں تذکیر و تانیث، واحد جمع کے استعمال کے معیارات وہ نہیں ہیں جو معیاری اردو کے تقاضے ہیں۔ اس لیے اکثر و بیشتر زبان و بیان کے کئی سقم اس کے باوجود موجود رہتے ہیں کہ مقالہ نگار کو اس

کی صحت پر غیر معمولی توجہ کرنا پڑتی ہے۔اس کی وجہ یہاں کی مقامی زبانوں میں مذکورہ اصولوں کا اردو سے مشابہ نہ ہونا ہے۔جس کے باعث کوشش کے باوجود اردو پر قدررت معیاری نہیں ہے۔علاوہ ازیں مقالوں میں جو عمومی صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ چند استثنیٰ کے علاوہ یہ ہے کہ مقالات کے ابتدائی ابواب کی زبان اور طرز بیان، انتخاب الفاظ کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے پر وقار ہوتی ہے۔لیکن وہ ذخیرہ الفاظ جو مستعار لیا گیا تھا ختم ہو جانے پر فطری اسلوب کا عمل دخل حاوی ہو جاتا ہے۔جس کی وجہ سے ایک ہی مقالہ نگار کے لکھے ہوئے مختلف ابواب ایک دوسرے کے تقابل میں ایک جیسے اسلوب کے حامل نہیں ہوتے۔اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ مقالے کے مختلف حصے مقالہ نگار کے اپنے نہیں ہوتے بلکہ ان مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں جو تحقیقی اسلوب کے اصول ڈھالنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔اس پس منظر میں پہلے مقالہ نگاروں کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے فطری اسلوب کو بروئے کار لائیں۔علمی،ادبی اور تحقیقی اصطلاحات کے استعمال میں بھی اس بات کا خیال رکھیں۔تاکہ اسلوب کی یکسانیت شروع سے آخر تک قائم رہے۔اور مقالہ اسلوب کے اعتبار سے ٹکڑوں میں بٹا ہوا نظر نہ آئے۔

ابلاغ کی الجھن اس وقت مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے جب طویل مرکب جملے تسلسل سے لائے جاتے ہیں۔یہاں مقالہ نگار کو رموز واوقاف سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔مقالات میں عمومی طور پر ختمہ کا استعمال درست ہے۔لیکن ان مقامات پر جہاں مرکب جملے ضروری ہو جائیں،ضروری ہے کہ حسب موقع وقفہ اور سکتہ کا استعمال کیا جائے۔جو بالعموم ضرورت کے مطابق نہیں ہوتے۔اسی طرح جب جملے،اگر،اور،تو،جو،جس،کہ، بلکہ،تاکہ،کیوں کہ،چوں کہ،لیکن جیسے حروف سے مرکب کئے جائیں۔تو جملے کے اس حصے کے آخر میں ختمہ لگایا جائے جہاں فعل کے آنے سے جملے کے مکمل ہونے کا تاثر ملتا ہو۔ان کی عدم موجودگی میں ابلاغ کے مسائل سامنے آتے ہیں مستقبل کے محققین کو ان امور اور رموز واوقاف کی ضروریات،ان کے استعمال کے محل سے واقف ہونے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔اول یہ کہ ان امور کا مطالعہ محقق پر چھوڑ دیا جائے۔دوم نگران ابتدائی مشق کے طور پر ایسی تحریریں لکھوائے کہ ان کے استعمال پر گرفت مضبوط ہو جائے۔اس کے بعد اصل مقالے پر کام شروع کیا جائے۔کمپیوٹر پر کمپوز شدہ مقالات کی ایک بدعت بھی لگاتار سامنے آرہی ہے۔Symbols کے عنوان کے تحت جو علامتیں موجود ہیں ان میں سے ☆،﴾ اور﴿ کا استعمال کوئی نکتہ نئی سطر میں پیش کرتے ہوئے کیا جانے لگا ہے۔حالانکہ ابھی یہ علامتیں اردو رموز واوقاف کا حصہ نہیں بنی ہیں۔اور نہ ہی ان کے استعمال کا محل متعین ہوا ہے۔اس لیے مقالات میں ان سے اس وقت تک صرف نظر کیا جانا چاہیے جب تک ان کے استعمال کے محل پر اکثریت کا

اتفاق رائے نہیں ہو جاتا، اوران کو استعمال کرنا ہی ہے تو پہلے ان کے محل کو مرتب کیا جائے۔تا کہ سب ہی ان سے مستفید ہو سکیں، اور اگر اس سلسلے میں کوئی علمی بحث درکار ہو تو اس کے بھی دروازے کھل جائیں گے۔

املا کی غلطیاں بھی مقالات میں عام ہیں۔ٹائپ کے زمانے میں یہ کم تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹائپ کرنے والے صحت املا میں پختہ ہوتے تھے۔اس لیے غلطیاں ہوتی ہی نہیں تھیں۔اگر ہو جاتی تھیں تو وہ انہیں پکڑنے کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔یا پروف ریڈنگ کے وقت مقالے کو غلطیوں سے پاک کر دیتے تھے۔اس طرح مقالہ نگار اضافی مشقت سے بچ جاتا تھا۔جب سے کمپیوٹر پر کمپوزنگ شروع ہوئی ہے۔املا کی غلطیوں کا شمار ہی نہیں ہے۔اس سے مقالے کی قرأت میں الجھن بڑھ گئی ہے۔اور اس کے قاری کو بے خطا جھنجھلاہٹ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔اگر چہ اس میں مقالہ نگار کی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام کوشش کے باوجود مکمل طور پر غلطیوں کی اصلاح نہیں کر پاتا ہے۔کیوں کہ وہ خود اس میدان میں کورا ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی وہ ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔اس لیے یہاں کے مقالات میں اس قسم کے عیب کے ذمہ دار بھی یہاں کے مقالہ نگار ہی ہیں۔اس کے حل کی وہی تراکیب ہیں جو دوسرے مراکز میں بروئے کار لائی جارہی ہیں۔بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ مقالہ نگار خود اپنے مقالے کو ٹائپ کرے۔اور اس سلسلے کی ضروری تربیت حاصل کرے۔مگر ابھی یہ تمنا یہاں خواب ہی ہے۔ان خامیوں کا تعلق اسلوب سے براہ راست تو نہیں ہے لیکن ان کی موجودگی سے اسلوب کے تعین میں بے شمار مشکلیں پیش آتی ہیں۔نوآموز محقق تو مقالہ نگار کے اسلوب کو جان ہی نہیں پاتے ہیں۔زبان کی سادگی کا اپنا اپنا معیار ہے۔اسے لگی بندھی بندشوں میں قید کرنا مناسب نہیں ہے۔یہاں کی سندی تحقیق اسی ضابطے کو نباہنے میں مصروف ہے۔

مقالات میں سابقہ ادبیات کے مطالعے کا شعبہ کم زور ہے۔بعض میں تو سرے سے یہ عمل موجود ہی نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ رویے جدید تحقیقی تصورات کے توسط سے حال ہی میں اردو کی ادبی تحقیق میں داخل ہوئے ہیں۔اب انھیں آہستہ آہستہ بہت اہمیت حاصل ہونے لگی ہے۔کیوں کہ یہی عمل محقق پر واضح کرتا ہے کہ اسے موضوع کی حدود میں رہ کر کیا کیا کرنا ہے۔جو ہو چکا ہے اس سے آگے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔اسی طرح مطالعے کے ارتقا کا براہ راست تعلق مفروضہ اور فرضیوں سے ہوتا ہے۔بعض مقالات میں چند سطور اس پس منظر میں مل جاتی ہیں۔لیکن ان کے بیان کا کوئی مقام اور مرحلہ متعین نہیں ہے۔مستقبل کے مقالہ نگاروں کو بالوضاحت اس کا بیان باب اول کے آغاز میں کرنا ہوگا۔تا کہ مقالے سے رہنمائی حاصل کرنے والوں کو قبل از وقت پتہ چل جائے کہ بات کہاں سے شروع ہو کر کن حقائق کو منکشف کرے گی۔اگر چہ یہاں کے بعض مقالات میں نئے نکات کا استخراج، نامکمل معلومات کی تکمیل کی کوشش اور صحت معلومات کے عوامل

موجود ہیں۔جن سے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ مقاصد تحقیق کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔لیکن قاری کی یہ رہ نمائی بہت کم یا بالکل نہیں ہوتی کہ موضوع پر یا اس کے قریب تر موجود مواد کی نوعیت کیا ہے؟ وہاں کون کون سی حقیقتیں موجود ہیں جن کا جاننا ضروری ہے؟ نیز وہ مطالعات ایسے کون کون سے سوالات کا جواز پیدا کرتے ہیں جو ابھی حل طلب ہیں۔یہ قباحت صرف بلوچستان کے مقالات میں ہی نہیں اردو کی ادبی تحقیق میں ہر جگہ ہیں۔حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ یہاں آج کا محقق اس نوع کی تحقیقی ضرورتوں کا اہتمام کرنے لگا ہے۔بلوچستان میں سندی تحقیق کے توسط سے دریافتوں کا عمل بھی زیادہ مضبوط نہیں ہے۔صرف دو مقالے ایسے ہیں جن سے یہ دروازہ کھلا ہے۔پہلا مقالہ ''براہوی اور اردو کا تقابلی مطالعہ'' ہے۔اور دوسرا ''محمد حسین عنقا: افکار و آثار'' ہے۔ابھی بلوچستان کا بہت سا ادبی سرمایہ کہیں دبا پڑا ہے۔ضرورت ہے کہ اسے بھی دریافت کیا جائے۔تاکہ یہاں کی اردو کی ادبی تاریخ کی تکمیل ہو، درست معلومات تک رسائی ممکن ہو سکے۔اور ماضی کے تخلیق کاروں کو ان کی محنتوں کا صلہ فکری، علمی اور ادبی سطح پر مل سکے۔حقائق کی بازیافت کی سند کے بارے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ کرنا اس لیے ممکن نہیں ہے کہ نئی معلومات کی بنیاد پر ہی ان کی صحت کو جانچا جا سکتا ہے۔جو ابھی ہونا باقی ہے۔بادی النظر میں فراہم کردہ نئی معلومات کا معیار اچھا ہے۔چند استثنیٰ سے قطع نظر بیش تر کو حوالے کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔جس قدر معیار تحقیق میں اضافہ ہوگا ان کی سند کا معیار بلند یا باطل ہوگا۔اس وقت بلوچستان میں بہت سی رکاوٹوں کے باوجود سندی تحقیق میں اضافہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں تحقیق کا مزاج بن رہا ہے اور اس کا ذوق فروغ پا رہا ہے۔بہتر سے بہتر کام کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔بعض محققین نے تحقیق کو طرز حیات بنا لیا ہے۔جو دوسروں کے ادبی تحقیق کے جوش کو ابھار رہا ہے۔مقالات میں ضمائم کی موجودگی بھی نئی دستاویزی شہادتوں کی تلاش پر اکسا رہی ہے۔البتہ بعض مقالات میں اشاریہ کی موجودگی اگرچہ ڈاکٹر نجم الاسلام کی ''رسمیات مقالہ نگاری'' کے منشا کے برعکس ہے، مگر ہے۔جب کہ بعض میں نہیں ہے۔اس سلسلے میں بھی جامعات کو سندی مقالہ نگاری کے پس منظر میں واضح معیارات کی تشکیل کرنا ضروری ہے۔

بلوچستان کے سندی محققین کے لیے ''نگران کا انتخاب'' کی اصطلاح غیر موزوں اور فی الوقت قدرے ناممکنات میں سے ہے۔کیوں کہ انتخاب وہاں ممکن ہے جہاں بہ یک وقت بہت سے نگران موجود ہوں۔یہاں ہر دور میں چند ہی نگران ایسے فراہم ہوتے رہے ہیں جو سندی تحقیق کی نگرانی کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔ایم اے کی سطح پر مقالہ نگاری نے یہاں کی جامعات میں ایک عشرہ بھی پورا نہیں کیا ہے۔اس سطح پر محقق کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ شعبہ اردو میں جتنے اساتذہ ہوتے ہیں وہ سب اس کام کے لیے موجود اور تیار ہوتے ہیں۔اس مرحلے پر نگراں کے انتخاب کا مرحلہ محقق نہیں بل کہ شعبہ اردو طے کرتا ہے۔صدر شعبہ کی

مشاورت سے ایک ایک دو دو مقالہ نگار ہر استاد کی صواب دید پر اس کی نگرانی میں دے دیے جاتے ہیں۔ کسی الجھن کی صورت میں صدر شعبہ اس مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ کسی کا انتخاب نگران اپنی پسند سے بھی کر لیتا ہے۔ یوں یہ مرحلہ بہ آسانی طے ہو جاتا ہے۔ اس سطح پر نگران کی تبدیلی کی نوبت بھی کم کم ہی آتی ہے۔ اور اگر آ بھی جائے تو صدر شعبہ اس کا حل نکال لیتا ہے۔ کیوں کہ صدر شعبہ با اختیار ہونے کی وجہ سے فوری فیصلہ کر لیتا ہے۔ یوں معاملات پیچیدہ نہیں ہوتے ہیں۔

ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر نگران کی تلاش اور اس کی آمادگی کڑا مرحلہ رہی ہے۔ بیسویں صدی میں تو طالب علم معینہ اہلیت کے استاد کے روبرو اس کے اظہار کی جرأت ہی نہیں کر پاتا تھا۔ عام طور پر کسی کی سفارش سے اس معاملے کو طے کیا جاتا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ جہاں اتفاقاً تیر لگ جاتا تھا اسی کے سر نگراں کی ہما بیٹھ جاتی تھی۔ آج بھی معاملہ یوں ہی ہے۔ ہر دور میں چند اساتذہ کے سوا یہ کام کوئی نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس کام کا کوئی محنتانہ، معاوضہ یا اعزازیہ نہ پہلے ملتا تھا نہ اب ملتا ہے۔ نگران صرف اپنے شوق کی بنیاد پر یہ بھاری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اکثر محقق طالب علم نگراں کے آرام اور ضروریات کے اوقات تک کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ جب جی چاہا نگراں کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ نگراں بھی انکساری میں بادل نہ خواستہ اس کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ اور متعلقہ مسائل میں رہ نمائی کر دیا کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ یہاں ''نگراں کا انتخاب'' کی بجائے ''محقق کا انتخاب'' ہوتا ہے۔ بلوچستان کی جامعات میں یہ بوجھ یہاں کے چند منتخب اساتذہ نے ہی اٹھایا ہے۔ جو اساتذہ یہ کام نہیں کرنا چاہتے تھے وہ یا تو سامنے ہی نہیں آئے یا ایک دو پر اکتفا کر کے دور ہٹ گئے۔ جن اساتذہ نے اب تک پی ایچ ڈی کے نگراں کے فرائض انجام دیے ہیں وہ سب اپنے اپنے عہد کے باوقار علمی اور تحقیقی منصب رکھنے والے اساتذہ تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر خلیل صدیقی، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر فاروق احمد، ڈاکٹر عبدالخالق بلوچ، ڈاکٹر ضیاالرحمن، ڈاکٹر خالد محمود خٹک اور ڈاکٹر علی کمیل قزلباش نے یہ ذمہ داریاں ادا کی ہیں۔ آج کی صورت حال کافی تشویش ناک ہے۔ اس وقت صرف ڈاکٹر ضیاالرحمن اور ڈاکٹر خالد محمود خٹک یہ کام کر رہے ہیں۔ ان دونوں اساتذہ پر کام کا دباؤ رفتہ رفتہ اس لیے بڑھتا جا رہا ہے کہ ان کے علاوہ جو پی ایچ ڈی اساتذہ یہاں موجود ہیں وہ یہ کام کرتے ہی نہیں ہیں۔ اور نئے پی ایچ ڈی اساتذہ سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ جس کا بڑا سبب دفتری عمل میں سست روی اور قواعد کی وہ جکڑ بندیاں ہیں جن کا اردو کی ادبی تحقیق سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ مگر اس کی زد میں سب ہی آئے ہوئے ہیں۔ اور کوئی بھی ان مسائل کے حل کے لیے خلوص نیت سے تیار نہیں ہے۔

۲۰۰۹ء کے بعد جامعہ بلوچستان میں پی ایچ ڈی کی کوئی رجسٹریشن عمل میں نہیں آئی ہے۔ ۲۰۱۳ء

تک پی ایچ ڈی کے تین مقالات زیرِ تحقیق ہیں۔توقع کی جاسکتی ہے کہ ۲۰۱۴ء میں یہ مقالات مکمل ہو جائیں گے۔ یہ اگرچہ سندی تحقیق کے اعتبار سے تو خوش آئند ہے لیکن مقام تاسف یہ ہے کہ تینوں مقالہ نگاروں کا تعلق بلوچستان کے مختلف کالجوں سے ہے۔یعنی ان کی کامیابی کے باوجود جامعات میں نگرانوں کی کمی دور نہیں ہوسکے گی۔ جامعات کے اساتذہ ابھی ایم فل کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ بیرون بلوچستان جامعات میں صرف ایک پی ایچ ڈی زیرِ تکمیل ہے۔ یہ محقق بھی کالج سے تعلق رکھتا ہے۔اس منظر نامے کی بنیاد پر یہ دعویٰ درست ہے کہ اکیسویں صدی کا دوسرے عشرے میں بھی نگرانوں کی تعداد میں اضافہ لاتا دکھائی نہیں دے رہا۔

اس پر مزید مشکل یہ ہے کہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن نے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کے لیے سختی سے پابندی لگادی ہے کہ بہ یک وقت کسی بھی نگراں کے زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کے زیادہ سے زیادہ چار اور ایم فل کے آٹھ مقالات لکھوائے جاسکتے ہیں۔ یہ قدغن ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر نئے بحران کی طرف اشارہ کررہی ہے۔اگر کسی طرح ایم فل اردو کے لیے جی آر ای میں نرمی پیدا ہوگئی یا موجود محققین نے جی آر ای کرلیا تو ایم فل کے لیے ہی نگراں میسر نہیں آسکیں گے۔ کیوں کہ سال ۲۰۱۳ء میں صرف ایس بی کے وومنز یونیورسٹی بلوچستان میں ہی ایم فل اردو میں دس سے زیادہ داخلے ہو چکے ہیں۔۲۰۱۴ء میں کورس ورک میں کامیابی کی صورت میں ان کے تحقیقی مقالات کی نگرانی کا معاملہ کمیشن کی نافذ کردہ پابندیوں کے تناظر میں ضرور اٹھے گا۔اس وقت نگراں کہاں سے فراہم ہوں گے؟ کیوں کہ موجود نگرانوں کی سپردگی میں وہ محقق بھی ہوں گے جو اس وقت اپنے مقالات کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں۔اور کسی بھی سبب بروقت کام مکمل نہ کرسکنے کی وجہ سے وقت میں اضافے کے استحقاق کو استعمال کرتے ہوئے کام جاری رکھیں گے۔

اس مسئلے کو کئی طریقوں سے حل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ جامعات کے فیصلہ ساز اور ہائر ایجوکیشن کمیشن ،اس خطے میں فروغ تحقیق اردو ادب کے لیے جائز نرم گوشے پیدا کریں۔اور معالات امور تحقیق کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے نیک نیتی پر مبنی برخلوص کوششیں کریں۔ پہلا قدم تو یہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ جامعات کے مطلوبہ اہلیت کے حامل ریٹائرڈ اساتذہ کو آبرو مندانہ مشاہرے پر اس کام کے لیے آمادہ کیا جائے۔صرف اخلاقیات کی بنیاد پر یا علمی خدمات کی کتابی باتیں سنا کر قائل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ کیوں کہ اس قسم کی سرگرمیوں کے حوصلہ افزا نتائج نہ تو پہلے برآمد ہوئے نہ آئندہ ہوں گے۔ دیگر پاکستانی جامعات کے اساتذہ کی خدمات بھی مستعار لی جاسکتی ہیں۔اس سلسلے میں بین الجامعات معاملات طے کیے جاسکتے ہیں۔اس عمل کی قباحتوں میں قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ بیرونی جامعات کے نگرانوں سے بالمشافہ رہ نمائی کے مواقع مشکل ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔اگر کسی طرح یہ صورت پیدا کر بھی لی جائے تو طالب علم پر کثیر مالی بوجھ پڑ جاتا ہے۔ نیز سفری مشکلات

اضافی ہیں۔ جسے برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔لہٰذا یہ صورت قابل عمل ہونے کے باوجود نا قابل عمل رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ایک طریقہ یہ ہے کہ کالجوں کے مطلوبہ قابلیت کے اہل اساتذہ کو یہ خدمات وقتی طور پر سونپ دی جائیں۔ جب یہ بحران رفع ہو جائے تو پھر اس کا رخ جامعات کے اساتذہ کی طرف موڑ دیا جائے۔اس میں دشواری یہ ہے کہ کالج اساتذہ کو بالعموم جامعات کی سطح پر تدریس کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا ہے۔اسی لیے انھیں کام کی اجازت نہیں ملتی ہے۔ایک موزوں طریقہ یہ ہے کہ جامعات خود اس بارے میں تیز رفتار طریقے استعمال کریں۔یوں جاری ایم فل کے محققین چند ہی سالوں میں پی ایچ ڈی کر کے یہ ذمہ داریاں احسن طریقے سے اٹھا سکتے ہیں۔جامعات اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کو ادبیات بالخصوص اردو کی اہمیت کو جان اور مان کر وظائف دے کر اس جانب مائل کرنا چاہیے۔جیسا کہ سائنس کے مضامین میں ہوتا چلا آرہا ہے۔اس پس منظر میں نگرانوں کی تعداد میں معقول اضافے کے لیے ہنگامی اور جنگی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ ترین سندی تحقیق میں بڑی رکاوٹ بلوچستان میں سندی تحقیق میں معاون و مددگار مرتب کتب خانوں کا نہ ہونا ہے۔کوئٹہ شہر بلوچستان کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔ یہاں جامعات کے ساتھ ساتھ سرکاری یا نجی کوئی کتب خانہ موجود نہیں ہے جو اہل تحقیق کی ضروریات کی تکمیل کے لیے جزوی طور پر بھی مواد فراہم کر سکے۔چند ایک کتب خانے جو تھوڑی سی معاونت فراہم کر سکتے ہیں وہ بھی مقفل رہتے ہیں۔جیسے قلم قبیلہ ریسرچ سینٹر کا کتب خانہ جو باقاعدگی سے نہیں کھلتا۔اعزازی منتظم کتب خانہ سے قبل از وقت رابطہ کر لیا جائے تو طے شدہ اوقات میں چند یا ایک روز کے لیے کتب خانہ کھول دیا جاتا ہے۔ورنہ نہ تو کسی کو جانے کا شوق ہے اور نہ ہی کتب خانہ اہل علم کو اپنی طرف کھینچنے کے ضروری لوازمات سے مزین ہے۔پبلک لائبریری عوام الناس کے لیے ہے۔لہٰذا عام قاری ہی وہاں جاتا ہے۔اردو کا محقق وہاں جائے بھی تو اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔جامعہ بلوچستان میں اگرچہ کتب کے وسیع ذخیرے کا اندراج متعلقہ رجسٹروں میں ہے۔مگر ضرورت کا مواد اس لیے دستیاب نہیں ہوتا کہ کوئی بھی طالب علم یا استاد کتب حاصل کرنے کے بعد مدتوں واپس نہیں کرتا یوں انتظار فقط انتظار ہی رہتا ہے۔ایس بی کے وومنز یونیورسٹی نئی جامعہ ہونے کی وجہ سے ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہے۔اس لیے مرکزی کتب خانے میں کتب تحقیق فی الوقت کم ہیں۔ یہاں بھی کتب کے جاری ہونے کے بعد کی وہی صورت حال ہے جو جامعہ بلوچستان کی ہے۔البتہ اس کے شعبہ اردو کا کتب خانہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اسے ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کی عطیہ کردہ سینکڑوں ایسی کتب مرتب انداز میں رکھنے اور مطالعہ کے عمل سے گزارنے کا اعزاز حاصل ہے جو اعلیٰ سطح کی تحقیق میں مفید ہیں۔مگر یہاں کتب کا اجرا نہیں کیا جاتا اور نہ ہی

مطالعے کے لیے وہ سہولیات موجود ہیں جو کتب خانوں میں لازمی ہوتی ہیں۔ اس کتب خانے کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ صرف طالبات یا خواتین کی رسائی میں ہے۔ مردوں کا جامعہ میں داخلہ ممنوع ہونے کی وجہ سے یہ ان کی دسترس سے باہر ہے۔ نجی کتب خانوں کے بارے میں عام طور پر معلومات ہی موجود نہیں ہیں اور نہ ہی یہ عام استفادے کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ اسی لیے برسوں پہلے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے یہاں کے کتب خانوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی:

''کوئٹہ میں اردو کتب خانے کی روایت بڑی کم زور ہے۔ اعلیٰ تحقیق کے لیے ضروری مواد دستیاب نہیں۔''۹

کتب خانوں کی عمارتوں میں تبدیلی نے بھی اس شعبے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بلوچستان کا سب سے قدیم کتب خانہ سنڈیمن لائبریری کوئٹہ ہے۔ جس کا قیام ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ جس کا نام اس وقت سنڈیمن میونسپل لائبریری رکھا گیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں اس کے لیے ایک شان دار عمارت کی تعمیر کی گئی جو ۱۹۵۳ء کے زلزلے میں تباہ ہوگئی۔ جسے بعد میں از سر نو تعمیر کیا گیا لیکن اس سانحے کے نتیجے میں قدیم کتب اردو کا ذخیرہ تباہ ہوگیا۔ اس کتب خانے کو پھر سے آباد کر دیا گیا اور جو کتب دستیاب ہوسکتی تھیں ان کی رفتہ رفتہ فراہمی شروع ہوگئی۔ یوں استفادے کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ ۱۹۸۶ء میں سول اسپتال کوئٹہ کی توسیع کی وجہ سے لائبریری کی عمارت کو مسمار کر کے کتب عارضی طور پر صوبائی لائبریری میں رکھ دی گئیں جو اس کے زوال باعث ہوا۔ افشاں خانم اس بارے میں سروے کے بعد لکھتی ہیں:

''۱۹۹۸ء میں جب لائبریری کے مختصر سے ہال میں کتب آویزاں کی گئیں اور موجود کتب کا موازانہ رجسٹر میں درج کتب سے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عوام کتب کے ایک بڑے ذخیرے سے ہاتھ دھو چکے ہیں زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اردو ادب سے متعلق کتب کا ذکر کیا جائے گا۔ اردو ادب کی کتب کو اصناف کے اعتبار سے پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں کتب ہونے کا تناسب کچھ اس طرح ہے

	جماعت کا نام	گم شدگی کا تناسب
الف	ناول اور افسانے	۸۲٪
ب	ڈرامے	۴۷٪
ج	نظم	۵۶٪
د	زبان و ادب	۴۶٪
ہ	سیاحت اور سفرنامے	۲۹٪۔'' ۱۰

کتب خانوں کو ایک عمارت سے دوسری میں منتقل کرنے سے یہاں جس قسم کے نقصانات ہوتے

رہے ہیں اس کی مختصر صورت گری یہ تھی۔ کم وبیش یہی حالت صوبائی لائبریری کی بھی رہی ہے۔ اس کی عمارت میں تبدیلی کے عمل سے اسے بھی بہت نقصان ہوا۔ کتب کا بیش قیمت نادر ذخیرہ اس طرح ضائع ہو گیا کہ اب بلوچستان کے اردو ادب سے متعلق اہم ترین نادر کتب منظر سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری نگرانی میں چلنے والے کتب خانوں کے بارے میں کوئی مربوط لائحہ عمل موجود ہی نہیں رہا ہے۔ اسی لیے عمارتوں کا ردوبدل اس تواتر اور بدسلیقہ انداز میں ہوا کہ کتب خانے اجڑ کر رہ گئے۔ کتب خانوں کی بربادی اور ماخذات تحقیق کی گم شدگی میں ایک عامل کتب کی چوری کا ہے جو یہاں عام بات ہے۔ اس کا وسیع تر نقصان یہ ہے کہ اہم ترین، نادر ماخذات عام استفادے کی حدود سے نکل کر ایک ہی گھر میں منتقل ہو کر استفادے کا دائرہ فردِ واحد تک محدود کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک دو نسلیں گزرتے ہی یہ اہم ماخذ مکمل طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ بلوچستان کے اردو ادب کی تاریخ میں گل دستہ ''قندیل خیال'' کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن اب اس کی اصل جلدیں نایاب ہو چکی ہیں۔ یہ بھی کتب خانے سے چوری ہو جانے کی وجہ سے محققین کی رسائی سے باہر ہو گئی ہے۔ یوں تحقیق کا ایک باب ایک طرح سے بند ہی ہو گیا ہے۔ اس ماخذ کی چوری کی روداد بیان کرتے ہوئے افشاں خانم لکھتی ہیں:

> ''لائبریری میں موجود رسائل کے شعبے میں 'قندیل خیال' کے شمارے بھی موجود تھے۔ بلوچستان کے اردو ادب کا انتہائی اہم، قدیم مطبوعہ اور دستاویز کی سی حیثیت رکھنے والا ورثہ تھا۔ قندیل خیال کا یہ اثاثہ ستمبر ۱۹۱۴ء سے دسمبر ۱۹۱۴ء تک چار شماروں کو یک جا کر کے مجلد کیا گیا تھا۔ ہر شمارے میں سردار محمد یوسف پوپلزئی کے زیرِ اہتمام لورالائی میں منعقد ہونے والے ماہانہ مشاعرے کے طرحی اور غیر طرحی کلام کو چھاپا جاتا تھا اس لیے اس میں ان شاعروں کے نام بھی درج ہوتے تھے۔ جن کا کلام پیش کیا جاتا تھا۔ یہ شمارے دلی میں چھپتے تھے راقم نے اسے مارچ ۲۰۰۶ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے بارے میں چند بنیادی معلومات درج کر لی تھیں۔ اس کے بعد 'قندیل خیال' کی جلدوں کا کوئی پتہ نہیں چلتا اندیشہ ہے کہ یہ قیمتی سرمایہ بھی ضائع نہ ہو جائے، یا صرف ایک شخص کی ملکیت بن جائے۔ اس طرح اس سے استفادے کا دائرہ بالکل محدود ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مقالہ ہٰذا کے لیے اس کی تفصیل جاننے کا موقع آیا تو یہ شمارے فراہم نہ ہو سکے۔ کتابوں کی گم شدگی کی موجودہ رفتار کا صرف اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے مگر اس نقصان کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو اس طرح علم و ادب کو مسلسل ہو رہا ہے۔''[۱۱]

اتنی اہم نوعیت کے ماخذات کی گم شدگی نے رفتہ رفتہ بلوچستان کے کتب خانوں کو تحقیقی طور پر مفلس کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ بلوچستان میں ادبی ارتقا سے متعلق بنیادی مواد بھی اس خطے میں موجود نہیں ہے۔ اس

کی تلاش کے لیے بھی بلوچستان سے باہر کی جامعات یا دیگر اہم کتب خانوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر تحقیق کے موضوع سے متعلق ضروری مواد فراہم ہوتا ہے۔ یہ صورت حال یہاں سندی تحقیق شروع ہونے کے ابتدائی زمانے میں بھی تھی اور آج بھی ہے۔ اگر چہ اس سلسلے میں فکری سطح پر بیداری پیدا ہوتی جا رہی ہے لیکن عملی طور پر نظر آنے والے ایسے اقدامات جن سے محققین کو ذہنی تقویت فراہم ہوا بھی دور دور تک نظر نہیں آتی۔ اس سلسلے میں جامعات کی بھی بنیادی ذمہ داری بنتی ہے۔ مگر یہاں بھی رقوم کی فراہمی اہم مسئلہ رہتی ہے۔ جامعہ بلوچستان تو ایک مدت سے اس قدر مالی بحران کا شکار ہے کہ یہاں کے اساتذہ اور دیگر اسٹاف کو تنخواہیں ادا کرنے کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ جس کے لیے متبادل ذرائع سے تنخواہیں فراہم کرنا عام ہے۔ جب کہ دیگر ادائیگیاں تو سال ہا سال تک موقوف رہتی ہیں۔ ایس بی کے وومنز یونیورسٹی اپنے قیام کا ایک عشرہ ابھی مکمل نہیں کر پائی ہے۔ دوسری جانب سرکاری طور پر رقوم کی فراہمی میں یہ ان چند جامعات میں سے ایک ہے جنھیں سب سے کم رقم دی جاتی ہے۔ یوں یہاں کی جامعات میں اردو ادب کی تحقیق کے ماخذات کی فراہمی صرف مطالبے کی حد تک محدود ہے۔ جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو میں شعبہ جاتی کتب خانہ موجود ہے، جس میں موجود کتب محققین کی ضروریات کو کم سہی مگر دعوت استفادہ دیتی چلی آ رہی ہے۔ جب کہ ایس کے بی وومنز یونیورسٹی میں تو شعبہ جاتی کتب خانوں کی نہ صرف کوئی روایت نہیں ہے بلکہ جامعہ کی اعلیٰ انتظامیہ اس بنیاد پر اس کی مخالفت کرتی ہے کہ امریکہ اور ترقی یافتہ دنیا میں صرف مرکزی کتب خانے کی روایت ہے۔ اس لیے وہاں تحقیق کا معیار بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ حالانکہ اس جامعہ کے مرکزی کتب خانے میں فی الوقت کسی بھی سطح کی اردو ادبی تحقیق کا مواد نہ ہونے کے برابر ہے اور کتب تحقیق کی فراہمی جس سست روی سے ہو رہی ہے اس کے پس منظر میں یہ کہنا بجا ہے کہ کئی عشروں تک مرکزی کتب خانہ اس مقام کو نہیں پہنچ پائے گا جہاں ادبی تحقیق کی ضروریات کی پچاس فیصد تکمیل ہو سکے۔ ان حالات میں شعبہ اردو نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک کتب خانہ مرتب کر لیا ہے۔ جہاں بنیادی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اردو کے ادبی ذخائر کی فراہمی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اس کتب خانے کا ایک ذیلی گوشہ نوادرات کے عنوان سے ہے۔ جس میں بلوچستان کے نادر اور کم یاب ادبی اثاثوں کو دریافت کر کے ان کی نقول کی فراہمی کا انتظام کر دیا گیا ہے اس ذخیرہ میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ رفتار یوں ہی قائم رہی تو اس شعبہ جاتی کتب خانے میں بہت سا نایاب اردو کا ادبی ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔ جو بلوچستان کے تناظر میں اردو کی ادبی تحقیق کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

ان حالات میں بلوچستان کی جامعات میں ۱۹۸۰ء میں پی ایچ ڈی اردو کی تحقیق کا آغاز ہوا۔

جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو میں اس سے تین سال پہلے ایم فل اردو کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ایم فل بھی ادھورا رہ جانے کے باعث شعبہ اردو میں اس سطح پر سندی تحقیق کا پہلا تجربہ تھا۔ جس کے لیے نہ تو کتب خانوں میں متعلقہ مواد موجود تھا اور نہ ہی ماضی کے ایسے نمونے تھے جنہیں سامنے رکھ کر آگے بڑھا جا سکے۔ جامعات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہاں تحقیق کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہی خصوصیت اسے کالجوں سے جدا کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بعض کالجوں میں ایم اے کی کلاسیں باقاعدگی سے ہوتی ہیں۔ لیکن تحقیق ہی جامعات کی شناخت ہوتی ہے۔ تحقیق کی رفتار اور معیار ہی سے جامعات کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اسی سے اس کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔ جامعہ بلوچستان کو قیام کے پہلے عشرے میں ہی اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اسے اپنی ساکھ بہتر بنانے کے لیے سندی تحقیق کو شروع کر دینا چاہیے۔ لہٰذا پی ایچ ڈی کے لیے پہلا داخلہ فردوس انور قاضی کو دیا گیا۔ ابتدا میں انہوں نے اپنا رجسٹریشن ایم فل کے لیے کرایا تھا۔ یہ رجسٹریشن ۱۹۷۷ء میں کیا گیا تھا۔ جس کے نگراں پروفیسر مجتبیٰ حسین تھے۔ موضوع کی اہمیت اور وسعت کو مدنظر رکھ کر اسے ۱۹۸۰ء میں پی ایچ ڈی میں تبدیل کر دیا گیا۔ محقق نے ۱۹۸۲ء میں مقالہ مکمل کر کے امتحان کے لیے پیش کر دیا۔ جس پر ۱۹۸۳ء میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ یہ بلوچستان میں شعبہ اردو کی طرف سے دی گئی پی ایچ ڈی کی پہلی ڈگری تھی۔ اس ایک تحقیقی کام نے بلوچستان کے محققین کو اس بات کی جانب راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا کہ وہ بھی پی ایچ ڈی کے مقالات لکھ کر اپنے ذوق تحقیق کی تسکین کا سامان کریں۔ لہٰذا جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو میں دیگر محققین نے بھی داخلہ لے کر اس فہرست میں اپنا نام لکھوانا شروع کر دیا۔

اس دور میں ایم فل اور پی ایچ ڈی الگ الگ کرنے کی روایت بہت کم تھی۔ بڑی اکثریت ایم فل میں رجسٹریشن کروا کر اسی موضوع کو پی ایچ ڈی میں منتقل کروا لیتی تھی۔ اس کے لیے رجسٹریشن کے ایک سال کے بعد کسی بھی وقت پی ایچ ڈی میں تبدیل کرانے کی درخواست دی جاتی تھی۔ نگراں کی مثبت سفارش پر ایم فل کے موضوع ہی پر نیا خاکہ اور تحقیقی تجویز بنا کر منظوری حاصل ہو جانے پر وہی موضوع پی ایچ ڈی کا موضوع ،اور ایم فل کا نگراں، پی ایچ ڈی کا نگراں بن جاتا تھا۔ یوں محقق اسی نگران کی رہنمائی میں اپنی تحقیق مکمل کرنے کے اقدامات کرتا تھا۔ بلوچستان کے جن محققین نے جامعہ بلوچستان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ان کا تفصیلی اشاریہ زمانی ترتیب میں یہ ہے۔

بلوچستان میں سندی تحقیق کی تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل ہونے میں چھے سال سے زائد کا عرصہ لگ گیا تھا۔ جب کہ اس وقت جامعہ کے قواعد کے مطابق اسے پانچ سالوں میں مکمل ہونا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ یہ مقالہ یہاں اردو کا اولین سندی کام

ہونے کی وجہ سے جامعہ کے دفتری امور میں کوئی ربط نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے ایم فل سے پی ایچ ڈی میں منتقلی میں بہت زیادہ وقت لگا۔ اس وجہ سے مقالہ نگار گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہا کہ وہ اپنی تحقیق کو اس پس منظر میں کیوں کر جاری رکھے۔ جب کہ پی ایچ ڈی کے لیے موضوع ہی منظور نہ ہوا ہو؟ یوں تین سال سے زیادہ کا عرصہ صرف اسی کام کی نذر ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مجموعی دورانیہ بھی بڑھ کر چھے سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہو گیا۔ اس کی روداد پروفیسر محمد ندیم خان یوں بیان کرتے ہیں:

> ''محترمہ فردوس انور قاضی کا موضوع تحقیق ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' جس کی ۱۹۷۷ء میں پروفیسر مجتبیٰ حسین کی نگرانی میں ایم فل کی سطح پر رجسٹریشن ہوئی تھی لیکن موضوع کی اہمیت اور وسعت کے پیش نظر ۱۹۸۰ء میں اسے پی ایچ ڈی میں تبدیل کر دیا گیا۔ چوں کہ افسانہ نگاری پر تاریخی تسلسل سے کوئی تحقیقی کام موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کام کو ایم فل تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کو پی ایچ ڈی میں تبدیل کر دیا جائے تا کہ موضوع زیر تحقیق کا مکمل احاطہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں یہ تحقیقی مقالہ سند کے لیے پیش کیا گیا اور یوں ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے نہ صرف شعبہ اردو بلکہ جامعہ بلوچستان کی پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا منفرد اعزاز حاصل کیا۔''[۱۲]

پی ایچ ڈی کے سلسلے کا یہ پہلا مقالہ ان امور کی کم زوریوں کے خط و خال واضح کر دیتا ہے جن کا تعلق مقالہ نگار سے نہیں تھا۔ لیکن اس کا نقصان مقالہ نگار کو ہی اٹھانا پڑا۔ دوسری جانب شعبہ اردو جامعہ بلوچستان پر بھی اس کے منفی اثرات یوں مرتب ہوئے کہ یہاں سندی تحقیق کے کام بروقت مکمل نہیں کرائے جا سکے۔ جب کہ اس سلسلے میں شعبہ اردو کا بھی کوئی قصور یوں نہیں تھا کہ اس نے اپنے حصے کے کام بروقت مکمل کر لیے تھے۔ جہاں خرابی تھی وہ شعبہ سے آگے کے دفتری امور میں تھی۔ اس کی زد میں جامعہ بلوچستان کا دوسرا مقالہ بھی آیا۔ جس کی تکمیل ۱۹۸۹ء میں ہوئی تھی۔ اس میں اگرچہ ابتداً مقالہ نگار کی عدم دلچسپی بھی ایک سبب تھی مگر یہ عدم دلچسپی بھی جامعہ کے دفتری امور کی سرد مہری کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی تھی۔ محقق نے پہلے ایم فل کے لیے موضوع ''قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری کے جدید رجحانات'' منتخب کیا تھا۔ لیکن مقررہ میعاد تک مقالہ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۸۳ء میں ان کی رجسٹریشن منسوخ کر دی گئی۔ انھوں نے ۱۹۸۴ء میں نئے موضوع ''جدید اردو شاعری اور ہیئت کے تجربے'' کی رجسٹریشن برائے پی ایچ ڈی کرائی اور ۱۹۸۹ء میں انھیں ڈگری مل گئی۔ ڈاکٹر فاروق احمد کی سندی تحقیق کے آغاز سے تکمیل تک کا زمانہ ۱۲ سال سے زائد بنتا ہے۔ یہ عرصہ بتاتا ہے کہ اس جامعہ میں سندی تحقیق کے لیے دفتری امور کار میں سہولت کی بجائے مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ جس سے تحقیق کاروں کی عمر کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ نتیجے میں مقالے کی تکمیل سے علم و آگہی کا بروقت پھیلاؤ متاثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالخالق بلوچ نے ابتداً اپنا وہ موضوع جس پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی

تھی، پی ایچ ڈی کے لیے منظور کرایا تھا۔ مگر دفتری جکڑ بندیوں اور ایسی ہی دیگر رکاوٹوں کی وجہ سے ایم فل میں تبدیل کرالیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اس کی شہادت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۷۷ء سے جامعہ بلوچستان میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کا ڈول ڈالا گیا۔ ۱۹۷۷ء ہی میں شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی کے لیے شعبے ہی کے دو اسسٹنٹ پروفیسر اور ایم فل کی سند کے لیے شعبے کے لیکچرر کا اندارج ہوا۔

(الف) پی ایچ ڈی کے موضوعات:

۱۔ شمیم احمد ''خاندان شاہ ولی اللہ کی خدمات''۔

۲۔ عبدالخالق بلوچ ''فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات تحقیق مزید کی روشنی میں''۔

(ب) ایم فل کے موضوعات:

۱۔ فردوس انور قاضی ''اردو افسانے کے نئے رجحانات''۔

۲۔ فاروق احمد ''قیام پاکستان کے بعد اردو شاعری کے جدید رجحانات''۔[۱۳]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبہ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر کو ایم فل لیڈنگ ٹو پی ایچ ڈی میں داخلے دیے گئے تھے۔ شمیم احمد نے تحقیق ترک کردی جب کہ عبدالخالق بلوچ نے اپنے موضوع کو پی ایچ ڈی تک لے جانے کی بجائے ایم فل کی ڈگری حاصل کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ اور بعد میں پی ایچ ڈی کے لیے نیا موضوع منظور کرایا تھا۔ جب کہ شعبے کے لیکچرار کو ایم فل میں داخلہ دیا گیا تھا۔ فردوس انور قاضی نے موضوع میں ردوبدل کے بعد اسے پی ایچ ڈی میں تبدیل کرالیا اور وہ جامعہ سے اردو کی پہلی پی ایچ ڈی ہونے کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اگرچہ جامعہ اور صدر شعبہ اردو کا یہ فیصلہ مناسب تھا کہ شعبہ کے اسسٹنٹ پروفیسرز اور لیکچرار کے لیے الگ الگ سندی تحقیق کی سطح منتخب کی جائے۔ لیکن نتائج اس کے برعکس یوں نکلے کہ ایم فل میں داخلہ لینے والے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے گئے اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے والوں کو ایم فل کی ڈگری پر قناعت کرنا پڑی۔

اب تک جامعہ بلوچستان سے صرف ۷۰ تالوں کو پی ایچ ڈی کی سند ملی ہے۔ یعنی ۴۰ سال میں یہاں پی ایچ ڈی اردو کے محقق اتنی محدود تعداد میں منظر پر آئے ہیں۔ بظاہر یہ تاثر درست نظر آتا ہے۔ لیکن اسے بلوچستان کی قلیل آبادی، خواندگی کے تناسب اور صرف ایک جامعہ کے ایک شعبے کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ تعداد مناسب ہی نہیں حوصلہ افزا بھی ہے۔ کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے یہاں پی ایچ ڈی کی سطح پر سندی تحقیق کے لیے لوگوں کو متحرک کیا اور بہت سے پاپڑ بیل کر مستقبل کے محققین کے لیے آسانیاں پیدا کر گئے۔ بیسویں صدی کے سترہ سالوں میں یہاں صرف چار پی ایچ ڈی تیار ہوئے۔ یوں عشرہ بہ عشرہ نہ

صرف محققین کی جستجو میں اضافہ نظر آتا ہے بلکہ تحقیق کی طرف والہانہ آمادگی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔اس منظر نامے کا ایک اور خوش آئند پہلو یہ ہے کہ سات مقالہ نگاروں میں سے تین خواتین ہیں۔ بلوچستان کے قبائلی معاشرہ کی جکڑ بندیوں میں خواتین کا اس بلند تحقیقی سطح پر آ کر کامیابیاں سمیٹنا اس بات کا مظہر ہے کہ یہاں نا مانوس طریقے سے خواتین کا تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم سے ناپسندگی کا سحر ٹوٹ رہا ہے۔سماجی طور پر یہ تبدیلی غیر معمولی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ جامعہ بلوچستان میں مخلوط تعلیم کا نظام موجود ہے۔ جہاں طالبات کی مجموعی تعداد بیسویں صدی میں بہت کم تھی مگر وہ اعلیٰ ترین سند کے حصول کے لیے وہ تمام ریاضتیں جھیلنے کو تیار تھیں جو عملی تحقیق میں پیش آتی ہیں۔

حواشی:

۱۔ گورنر بلوچستان اویس غنی نے تعمیر نو یونیورسٹی کے قیام کی بھی منظوری ۲۰۰۵ء میں دی تھی۔لیکن منتظمین نے سوچ بچار میں خاصا عرصہ صرف کیا اور یونیورسٹی قائم نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔اس عمل کے پیچھے موزوں جگہ اور وسائل کے ساتھ فیکلٹی کی فراہمی کے مسائل بھی درپیش تھے۔اس یونیورسٹی کو کوئٹہ میں قائم کیا جانا تھا۔اس وقت بلوچستان بالخصوص کوئٹہ میں امن وامان کے شدید مسائل موجود تھے۔اساتذہ کی ٹارگٹ کلنگ (شعوری قتل) عروج پہ تھی۔جس کی وجہ سے یہ طبقہ شدید خوف وہراس میں مبتلا تھا۔اپنے اپنے شعبے کے بے شمار ماہر اور مستند اساتذہ بددل ہوکر بلوچستان سے جارہے تھے۔موجود اور جمی جمائی جامعات میں بھی بحران کی کیفیت تھی۔ایسے میں نئی جامعہ قائم کر کے تدریسی سرگرمیوں کا آغاز بہت مشکل کام تھا۔اس پس منظر میں تعمیر نو یونیورسٹی کی تشکیل کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔دوسری جانب الحمد اسلامک یونیورسٹی کوئٹہ کی انتظامیہ نے اپنی جامعہ کو نہ صرف قائم کیا بلکہ ہر رکاوٹ سے نبرد آزما ہوکر تدریسی سرگرمیوں کا آغاز بھی کردیا۔اس جامعہ کو بھی تعمیر نو یونیورسٹی کے ساتھ ہی چارٹر ملا تھا مگر ایک قائم ہوئی اور دوسری کا قیام اب تک ممکن نہیں ہوسکا ہے۔بہرطور الحمد اسلامک یونیورسٹی نجی شعبے میں قائم ہونے والی بلوچستان کی پہلی یونیورسٹی ہے۔

۲۔ پاکستان دنیا کے ان چند ہی ملکوں میں سے ایک ہے جہاں آئینی طور پر مسلمہ قومی زبان کو اس کے درجے سے گرائے جانے کی سیاسی اور علمی سطح پر کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔دستور پاکستان ۱۹۷۳ء اس بات کی ضمانت دے رہا تھا کہ ضروری عملی تیاریوں کے دس سال بعد ۱۹۸۳ء میں اردو کو سرکاری زبان بنادیا جائے گا۔لیکن ایسا اب تک نہیں ہوسکا ہے۔ جہاں اردو سے نفع آوری کے مواقع ہوں تو اسے بین الاقوامی زبان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہے، وہاں اسے علاقائی زبانوں سے بھی کم رتبہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اب تو ببانگ دہل یہ دعوے بھی شروع ہوگئے ہیں کہ اردو بھی دوسری علاقائی زبانوں کی طرح ایک علاقائی زبان ہے۔ جس کا علاقہ کراچی، حیدرآباد وغیرہ ہیں۔یعنی تعصبات کی گہری مربوط اور مضبوط فضا ہے جس میں سے اردو خود بہ خود پنپ رہی ہے۔ایسی صورت میں یہ جامعات میں اپنے قدم جمانے سے قاصر چلی آتی ہے۔ حالانکہ یہ مارکیٹ ہی کی نہیں رابطے کی بھی سب سے بڑی زبان ہے۔اس صورت حال میں جو اساتذہ اردو درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں ان کی

خدمات قابل تحسین ہیں۔

۳۔ بلوچستان میں اردو کے مقامی ادیبوں کی زبان کے معیار کے بارے میں آغا محمد صادق نے اپنی کتاب ''بردوش ہوا'' میں ۱۹۶۱ء میں تحریر کیا تھا۔ ''پشتو، بلوچی، فارسی وغیرہ زبانوں میں بخلاف اردو تذکیروتانیث، غیر حقیقی افعال وضمائر میں تذکیروتانیث حقیقی کا جھنجھٹ نہیں ہے، اس لیے اردو کے پیچیدہ قواعد تذکیروتانیث کے لحاظ کی توقع یہاں بے سود ہے۔'' ص ۲۸۲۔

۴۔ پراسپیکٹس، سندھ یونیورسٹی جامشورو، ص ۱۱۔

۵۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: تحقیق کے بنیادی لوازم، مشمولہ، تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات، مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۲۷۔۱۲۸۔

۶۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے ۳۵ سال، مشمولہ، اردو میں اصول تحقیق، جلد دوم، مرتبہ، سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر، ص ۴۷۲۔

۷۔ پروفیسر نسرین زہرا: فرضیات اردو تحقیق، مشمولہ اردو تحقیق (منتخب مقالات) مرتبہ عطش درانی، ص ۱۵۴۔۱۵۵۔

۸۔ تحقیق، جلد ۱۷، شمارہ ۱، ص ۶۲۔

۹۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے ۳۵ سال، مشمولہ، اردو میں اصول تحقیق، جلد دوم، مرتبہ، سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر، ص ۴۷۲۔

۱۰۔ افشاں خانم: سنڈیمن لائبریری ماضی وحال، مشمولہ، قلم قبیلہ، تحقیقی وتنقیدی مجلہ (۱)، ص ۱۶۳۔۱۶۴۔

۱۱۔ افشاں خانم: ایضاً، ص ۱۶۴۔

۱۲۔ پروفیسر محمد ندیم خان: ''جامعہ بلوچستان میں اردو تحقیق''، ص ۲۔

۱۳۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ایضاً، ص ۴۷۲۔

فہرست اسناد محولہ:

کتب:

۱۔ پراسپیکٹس: ۲۰۱۳ء، سندھ یونیورسٹی جام شورو۔

۲۔ خان، محمد ندیم: ۲۰۱۳ء، ''جامعہ بلوچستان میں اردو تحقیق''، غیر مطبوعہ مقالہ، کوئٹہ۔

۳۔ درانی عطش (مرتب) ۲۰۰۳ء، ''اردو تحقیق (منتخب مقالات)''، مقتدرہ قومی زبان۔

۴۔ راہی، اعجاز (مرتب): ۱۹۸۸ء، ''تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات''، جلد دوم، اسلام آباد۔

۵۔ سلطانہ بخش، ایم، ڈاکٹر (مرتب): ۱۹۸۸ء، ''اردو میں اصول تحقیق''، جلد دوم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

رسائل:

۱۔ شش ماہی ''تحقیق'': ۲۰۰۹ء، شعبہ جاتی تحقیقی مجلہ، شمارہ ۱۷، شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔

۲۔ مجلہ ''قلم قبیلہ'': ۲۰۰۶ء، شمارہ ۱، قلم قبیلہ ادبی ٹرسٹ وریسرچ سینٹر، کوئٹہ۔